تحریک پاکستان کے رہنما

سردار عبدالرب نشترؒ

سید قاسم محمود

قائداعظمؒ کی زیرصدارت مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں
سردار عبدالرب نشترؒ بھی شریک ہیں۔

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

ایوان کارکنان تحریک پاکستان، مادر ملت پارک، شاہراہ قائداعظم لاہور۔ فون: 4-99201213

فیکس: 99202930 ای میل: trust@nazariapak.info ویب: www.nazariapak.info

سردار عبدالرب نشترؒ

سید قاسم محمود

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب کے مندرجات کی ذمہ داری مصنف پر ہے

تصنیف	:	سردار عبدالرب نشترؒ
مصنف	:	سید قاسم محمود
ناشر	:	نظریۂ پاکستان ٹرسٹ
طابع	:	نظریۂ پاکستان پرنٹرز
مہتمم اشاعت	:	رفاقت ریاض
ڈیزائنر	:	محمد شہزاد یٰسین
کمپوزر	:	شاہد گلزار
اشاعت دوم	:	جون 2009ء
تعداد اشاعت	:	1000
قیمت	:	150 روپے

Published by

Nazaria-i-Pakistan Trust

Aiwan-i-Karkunan-i-Tehreek-i-Pakistan, Madar-i-Millat Park,
100-Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore. Ph. 99201213-99201214
Fax. 99202930 E-mail:trust@nazariapak.info Web:www.nazariapak.info

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers,
10-Multan Road, Lahore. Ph: 37466975

ابتدائی کلمات

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اُجاگر کیا جائے' نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہلِ وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ نے وطن عزیز کی نئی نسل کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنایا ہے کیونکہ ہماری نسلِ نو ہی ہمارے ملک و قوم کا مستقبل ہے اور ان کے فکر و عمل کو علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار و کردار کے سانچے میں ڈھال کر ہی ہم اپنے مستقبل کو زیادہ روشن اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیر تحریک پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو

حاصل کرلیا مگر ہم اسے قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کے مطابق اسلامی نظریۂ حیات کا قابلِ تقلید نمونہ نہیں بنا سکے۔ بانیٔ پاکستان کے وصال کے بعد قوم کے نام نہاد قائدین نے ان کے نظریات سے انحراف کو اپنا وطیرہ بنا کر اس ملک کو فوجی وسول آمریتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی جدوجہد کے باعث اگرچہ ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط اور غلبے سے نجات حاصل ہوگئی مگر آج ہم ایک دوسری طرح کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں جس سے نجات کے حصول کے لئے ہمیں از سرِ نو قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ صرف اسی طرح ہم وطنِ عزیز کو ایک جدید اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت تحریک پاکستان میں طلباء وطالبات نے ہر محاذ پر مسلم لیگ کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی شب وروز جدوجہد کے طفیل برصغیر کا ہر گوشہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' کے روح پرور نعروں سے منور ہوگیا تھا۔ بابائے قوم نے بارہا ان کی خدمات کو سراہا تھا اور ان پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یہی ہیں وہ مردانِ عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔'' مجھے قوی اُمید ہے کہ زیرِ نظر تصنیف کا مطالعہ ہماری نئی نسل میں اس عقابی روح کو بیدار کردے گا جو تحریکِ پاکستان کا طرّۂ امتیاز تھی اور وہ نظریۂ پاکستان کی مبلّغ بن کر پاکستان کو علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے رہائی دلا کر وطنِ عزیز کی کشتی ساحلِ مُراد تک پہنچائے گی۔

مجید نظامی

(مجید نظامی)
چیئرمین

سردار عبدالرّب نشترؒ کے فرزند

جمیل نشتر کے نام

پیش لفظ

وطنِ عزیز آج کل مشکل حالات سے دوچار ہے۔ ان حالات میں قوم کو حصولِ پاکستان کے لیے ان کے آباو اجداد کی جدوجہد اور قربانیوں کی یاد دہانی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ تمام تر مشکلات کے باوجود پاکستان کا معرضِ وجود میں آ جانے کا سبب یہ تھا کہ تحریکِ پاکستان میں مسلمانوں کے قائدین انتہائی دور اندیش تھے جن کی مقصد سے بے لوث وابستگی اور دیانت داری کے طفیل یہ معجزہ رونما ہو گیا۔ ہمارے دادا جان سردار عبدالرّب نشترؒ بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے سچے پیروکار اور مخلص رفیق تھے اور ہمارے خاندان کو اس پر بجا طور پر فخر ہے۔ اتنے عظیم انسان کی اولاد میں سے ہونے پر میں ذاتی طور پر بڑی عاجزی محسوس کرتا ہوں۔ ان سے ورثے میں ملنے والی اقدار اور اصولوں نے ہماری زندگیوں کو ایک خاص نہج عطا کی ہے اور انہوں نے اپنی زندگی میں جن اصولوں کو حرزِ جاں بنائے رکھا، ہم بھی انہی کی پیروی کیلئے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔

میں نظریۂ پاکستان ٹرسٹ اور اس کے چیئرمین جناب مجید نظامی کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑے اہتمام سے اس کتاب کو شائع کیا۔ سیّد قاسم محمود نے بڑے جامع اور شاندار انداز میں تحریکِ پاکستان میں سردار عبدالرّب نشترؒ کے کردار کو صفحۂ قرطاس پر اجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کو سردار عبدالرّب نشترؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے عبدالجمیل نشتر کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ انہی اقدار

اور مقاصد کو سامنے رکھا جن کے لئے ان کے والد گرامی جدوجہد کرتے رہے' انہی حدود و قیود کی پاسداری کی جنہیں ان کے والد محترم نے متعین کیا تھا۔ اس دوران انہوں نے اپنی نجی ذمہ داریوں اور قومی تقاضوں کے مابین ایک توازن قائم رکھا تاہم اکثر و بیشتر موخر الذکر کے حق میں پلڑا جھکتا رہا۔

یہ کتاب سردار عبدالرّب نشترؒ کے سادہ طرزِ زندگی' دیانتداری' خلقِ خدا کی خدمت اور حب الوطنی کے عظیم الشان اوصاف کو بڑے احسن انداز میں اجاگر کرتی ہے جو آج کل بھی کارِ جہانبانی کے لئے رہنما کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہمارے موجودہ رہنماؤں میں ان اوصاف کی موجودگی ملک کو درپیش حالیہ سیاسی' معاشی اور سماجی مسائل سے نجات دلانے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب انتہائی قابلِ قدر ہے اور اس کے مندرجات نسلِ نو کو ایک نئے ولولے اور جذبے سے سرشار کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں کیونکہ اب ہماری نئی نسل نے ہی اقوامِ عالم میں پاکستان کی نمائندگی کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔

محمد غالب نشتر

حسنِ ترتیب

1-	صوبہ سرحد کا آئینی پس منظر	11
2-	ولادت اور ابتدائی تعلیم	15
3-	تحریک خلافت میں شمولیت تحریک ترک موالات۔تحریک ہجرت۔شدھی کی تحریک بالاحصار کے قید خانے میں	20
4-	1937ء کے انتخابات یوم نجات۔مسلم لیگی وزارت میں شمولیت	31
5-	1946ء کے انتخابات عبوری حکومت میں شمولیت۔پارٹیشن کونسل میں شمولیت	37
6-	قیام پاکستان کے بعد وزیر مواصلات۔مشترکہ ڈیفنس کونسل میں شرکت۔دستور کمیٹی کی کنوینر شپ	43
7-	پنجاب کی گورنری سردار نشترؒ: نائب وزیر اعظم!	49
8-	وزارت سے برطرفی	56
9-	پاکستان مسلم لیگ کی صدارت	60
10-	آخری ایام، وفات اور تدفین	67

11- خطبات نشترؒ 73
پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس (مارچ 1948ء)
کل پاکستان اردو کانفرنس (اپریل 1951ء)
قائد اعظمؒ کی پہلی برسی (11 ستمبر 1949ء)
پاکستانی پرچم کا پس منظر (1953ء)
اسلام کا نظریۂ تعلیم (فروری 1969ء)
اتفاق اور یک جہتی (ستمبر 1955ء)
12- نشترؒ کی شاعری 103
13- اہل قلم کا خراج تحسین 114
آغا شورش کاشمیری - ابراہیم جلیس - الطاف حسن قریشی
14- اشاریہ 128

صوبہ سرحد کا آئینی پس منظر

آج پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تین صوبے ایسے ہیں جو حصولِ آزادی کے وقت برِ اعظم کے انتہائی شمال مغرب میں واقع تھے۔ یہ تینوں صوبے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پسماندہ تھے۔ معیشت' تعلیم ہر لحاظ سے پیچھے تھے۔ بلوچستان کو تو باقاعدہ صوبے کا درجہ قیامِ پاکستان کے بعد ملا ورنہ یہ گورنر جنرل کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ماتحت تھا۔ سندھ اور صوبہ سرحد کو صوبے کا درجہ 1934ء میں گول میز کانفرنس کے مذاکرات کے نتیجے میں' قائداعظمؒ اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کوششوں سے ملا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی' منعقدہ 29 مارچ 1929ء کو ایک قرارداد کے ذریعے' جو قائداعظمؒ کے چودہ نکات کے نام سے شروع ہوئی' دونوں صوبوں کی آئینی خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا' یہ کہ سندھ کو صوبہ بمبئی سے علیحدہ کر کے جداگانہ صوبے کی حیثیت دی جائے اور دیگر صوبوں کی مانند سرحد اور بلوچستان میں بھی آئینی اصلاحات جاری کر کے ان کو صوبے کا درجہ دیا جائے۔

ان تینوں صوبوں میں مسلم لیگ کا نام و نشان تک نہ تھا' اور تھا تو برائے نام۔ 1934ء کے بعد جن دردمند اور مخلص حضرات نے مسلم لیگ کے مقاصد کو برحق سمجھا اور مسلم لیگ کو اپنے اپنے صوبے میں پھیلایا' اُن میں سے ہر صوبے کے دو دو رہنماؤں کے نام لیے جائیں تو بلوچستان میں قاضی محمد عیسیٰ اور میر جعفر خان جمالی' سندھ میں عبداللہ ہارون اور جی ایم سید' اور صوبہ سرحد میں اورنگ زیب خان اور سردار عبدالرب نشترؒ کے نام ازخود سامنے آتے ہیں۔

سردار عبدالرب نشترؒ کے حالات زندگی اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی تنظیم کے لیے اُن کی خدمات' اور ملک گیر سطح پر مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے اُن کے کارناموں کی تفہیم کے لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ جس صوبے میں انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا نصف حصہ سخت جدوجہد میں گزارا تھا' اُس کی سیاست کا نقشہ ہمارے سامنے رہے۔ خصوصاً صوبہ سرحد ایسا خطہ تھا جہاں حصولِ آزادی تک نیشنل کانگرس اور خدائی خدمت گاروں کا اقتدار رہا' یہاں تک کہ وہاں قیامِ پاکستان کے لیے ریفرنڈم کرانا پڑا۔ برعظیم کے تمام صوبوں کے مقابلے میں مسلم لیگ کا پیغام پھیلانے کے لیے وہاں کے زمینی حالات سخت سنگلاخ تھے' جن کا مقابلہ سردار عبدالرب نشترؒ نے انتہائی بے جگری' ذاتی ایثار' غیر معمولی اخلاص اور زبردست سیاسی تدبر سے کیا اور کامیاب وسرخرو ہوئے۔

صوبہ سرحد میں چار طرح کے علاقے شامل ہیں: سرحدی یا آئینی اضلاع (جن کو اب ڈویژن کہا جاتا ہے)' وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقے' وفاق کے زیرِ انتظام غیر قبائلی علاقے' جسے آزاد علاقہ بھی کہا جاتا ہے اور شمالی علاقہ جات۔

با قاعدہ آئینی اضلاع پانچ ڈویژنوں پر مشتمل ہیں:-

1) مالاکنڈ ڈویژن (دیر' سوات' مالاکنڈ' چترال)

2) پشاور ڈویژن (پشاور' مردان' صوابی)

3) ہزارہ ڈویژن (کوہستان' مانسہرہ' ایبٹ آباد)

4) کوہاٹ ڈویژن (کوہاٹ' کرک)

5) ڈیرہ اسماعیل خان (بنوں' ڈیرہ اسماعیل خان)

وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقے' جن کو عرفِ عام میں اب ''فاٹا'' کہا جاتا ہے' پہلے پولیٹیکل ایجنسیاں کہلاتے تھے' یعنی باجوڑ ایجنسی' مہمند ایجنسی' خیبر ایجنسی' کرم ایجنسی' اورک زئی ایجنسی' شمالی وزیرستان' جنوبی وزیرستان۔

فاٹا اور آزاد علاقے کا نظم ونسق آئینی پانچ ڈویژنوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں پولیس ہے نہ عدالتیں۔ قبائلی اپنے تنازعات اپنے جرگوں میں طے کرتے ہیں۔ حکومت اُن کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔

شمالی علاقہ جات کا اب ایک ڈویژن بنادیا گیا ہے جو گلگت ڈویژن کہلاتا ہے۔ اس میں پانچ اضلاع شامل ہیں۔

سکھوں کی حکومت

نادر شاہ دُرانی نے 1739ء میں دریائے سندھ کو عبور کر کے بالکل اُسی طرح جیسے تیمور لنگ نے 1388ء میں کیا تھا' اس علاقے کو تاخت وتاراج کیا۔ اس کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے (1743-1773ء) قندھار' کابل اور غزنی کے ساتھ ساتھ پشاور' ڈیرہ جات' ہزارہ' سندھ' کشمیر اور ملتان کو ملا کر ایک جداگانہ دُرانی ریاست قائم کی۔

دُرانی سلطنت کے زوال کے بعد سکھوں کی حکومت 1822ء میں قائم ہونے تک مغلیہ مرکزی حکومت کی اس علاقے پر ایک بے قاعدہ اور غیر مسلسل حکمرانی تھی۔ پنجاب کے سکھ حکمران راجا رنجیت سنگھ نے صوبہ سرحد سے افغانوں کو نکال دیا۔ 1820ء تک پشاور' بنوں' کوہاٹ اور ڈیرہ جات کے کچھ حصے پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ گویا انہوں نے افغانوں کو دریائے سندھ کے پار' پہاڑوں میں بھگا کر موجودہ صوبہ سرحد کی بنیاد ڈالی مگر سکھوں کی حکومت صوبہ سرحد پر (1822-1848ء) محض تلوار اور جبر وتشدد کی حکومت تھی۔ درمیان میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل نے سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا اور سرحد میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا تو اگرچہ انہیں غداروں کی وجہ سے شکست ہوئی لیکن سکھ حکومت لڑکھڑا گئی۔ 1849ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پشاور' ہزارہ' کوہاٹ' بنوں' ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کو صوبہ پنجاب کا حصہ بنایا بلکہ مالاکنڈ ایجنسی کے علاوہ دیگر ایجنسیاں بھی پنجاب

کے زیرِ انتظام دے دی گئیں۔ 1901ء میں وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے پنجاب سے پشاور، ہزارہ، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کو علیحدہ کر کے ''شمال مغربی صوبہ سرحد'' کے نام سے ایک نیا صوبہ قائم کیا۔ (اُس وقت عبدالحنان کا بیٹا عبدالرب صرف ایک سال کا دودھ پیتا بچہ تھا)۔

☆ ☆ ☆

ولادت اور ابتدائی تعلیم

عبدالرب نام، نشتر تخلص، 13 جون 1899ء کو پشاور کے محلّہ رام پورہ، کوچہ کاکڑاں میں پیدا ہوئے۔ یہ محلّہ ریتی دروازے کے سامنے واقع تھا۔ اُن کے والد عبدالحنان اُن کی پیدائش کے وقت کوہاٹ میں تھے۔ وہ ریلوے کے ٹھیکیدار تھے اور افغان قبیلے کاکڑ کے ایک سربرآوردہ اور معزز رُکن تھے۔ یہ قبیلہ انگریزوں کا جانی دشمن تھا۔ نشترؒ کے اجداد ژوب وادی (بلوچستان) میں قیام پذیر تھے۔ انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر نقل مکانی کر کے قندھار چلے گئے۔ اُن کے دادا عبدالرحمٰن نے قندھار میں رہنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ انگریز تو یہاں بھی پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ یہ خاندان اپنا سب مال و اسباب قندھار ہی میں چھوڑ کر پشاور آ گیا۔ عبدالحنان نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے سات بیٹے پیدا ہوئے، دوسری بیوی سے ایک بیٹا، اور تیسری سے ایک بھی نہیں۔ دادی نے نومولود کا نام عبدالرب رکھا۔

نشترؒ کے والد اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے مناسب توجہ نہ دے سکے۔ چنانچہ نشترؒ کی ابتدائی پرورش اور اُن کی شخصیت کو اُبھارنے میں اُن کی والدہ کا ہاتھ ہے۔ نشترؒ کا پورا گھرانہ مذہبی تھا۔ اسلامی ماحول، صوم وصلوٰۃ کا پابند۔ والدہ نے نشترؒ کو گھٹی کے ساتھ ساتھ اسلام کی محبت بھی پلا دی۔

نشترؒ نے پانچویں جماعت چیپل سکول، پشاور سے پاس کی۔ پھر مشن ہائی سکول، پشاور میں داخلہ لیا۔ میٹرک مشن ہائی سکول سے نہ کر سکے۔ دسویں جماعت میں تھے کہ مشن ہائی سکول سے منتقل ہو کر سناتن دھرم ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ کچھ اس تبدیلی کا اثر تھا اور کچھ اس لیے کہ وہ

عین امتحان کے موقع پر ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا ہو گئے' وہ 1917ء کے میٹرک کے امتحان کے لیے داخلہ نہ لے سکے۔ 1918ء میں میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اب مشن کالج میں داخلہ لیا۔ 1920ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا لیکن تاریخ کے پرچے میں فیل ہو گئے۔

نشترؒ کے والد صاحب کاروباری آدمی تھے۔ چاہتے تھے کہ بیٹا اُن کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹائے اور مزید تعلیم حاصل نہ کرے لیکن نشترؒ تعلیم حاصل کرنے پر مُصر رہے' چنانچہ انہیں دوبارہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے کی اجازت مل گئی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ نشترؒ کے ایک مخلص دوست تھے' سید تجمل حسین' جو شاہ محمد غوث گیلانی کی اولاد میں سے تھے جن کا مسلک قادریہ چشتیہ تھا۔ پشاور کے لوگوں میں اس سید گھرانے کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اُن کے ہاں مذہبی تقریبات دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔ اسلامی احکام وتعلیمات پر رشد وہدایت کے وعظ ہوتے تھے۔ قوالیاں ہوتی تھیں۔ سید گھرانے کے اس مذہبی ماحول کا اثر نشترؒ صاحب کے ذہن پر بہت گہرا ہوا۔ گھر کے اسلامی ماحول اور سید گھرانے کے اثرات نے اُن کی شخصیت وکردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اپنی آئندہ عملی زندگی میں انہوں نے کبھی اس سے انحراف نہیں کیا۔ اسلامی تصوف کا رنگ اُن پر خاصا چڑھ گیا تھا۔ پھر شاعری کی بھی خداداد صلاحیت رکھتے تھے اور پشتو کے علاوہ اُردو اور فارسی پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ سید تجمل حسین نے مشورہ دیا کہ منشی فاضل کر لو۔ اُس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے یہ سہولت حاصل تھی کہ اُردو' فارسی یا عربی میں ''فاضل'' کا نصاب پاس کرنے کی صورت میں صرف انگریزی کا امتحان پاس کرنے پر بی اے کی ڈگری مل جاتی تھی۔ چنانچہ نشترؒ صاحب نے پہلے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر اُس کی بنیاد پر 1923ء میں بی اے کا امتحان دیا۔ گریجویشن کی ڈگری حاصل ہونے پر اُن کے والد صاحب کو بھی یقین ہو گیا کہ نشترؒ اُن کے سابقہ قول کے مطابق پھسڈی نہیں ہے' بلکہ واقعی ذہین ہے اور اس لائق ہے کہ اسے اعلیٰ تعلیم

دلوائی جائے۔ چنانچہ نشترؒ صاحب نے ایل ایل بی کی ڈگری 1925ء میں حاصل کی اور وکالت کا لائسنس بھی حاصل کر لیا۔ جس وقت وہ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے اُس دوران اُن کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ لائسنس ملتے ہی انہوں نے پشاور میں وکالت شروع کر دی۔ وہ خان بہادر سعد اللہ خان کے ساتھ وابستہ ہو گئے جو اُس وقت کے پشاور کے بہت مشہور ایڈووکیٹ تھے۔ نشترؒ صاحب نے وکالت اور قانون کی تمام پیشہ ورانہ تربیت اور مہارت خان صاحب سے حاصل کی۔ جب 1926ء میں سعد اللہ خان کو ایڈیشنل جوڈیشیل کمشنر مقرر کیا گیا تو نشترؒ صاحب نے اپنی قانونی پریکٹس کے لیے اپنا دفتر الگ قائم کر لیا۔

نشترؒ صاحب سکول کی تعلیم کے دوران بڑے شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے طالب علم تھے۔ جب وہ سناتن دھرم ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتے تھے تو ایک ہندو استاد سے ایک ناخوشگوار تصادم ہو گیا۔ استاد مذکور جابر قسم کا آدمی تھا اور کلاس رُوم میں طلبہ کو بولنے اور پوچھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک دفعہ طلبا نے آپس میں مشورہ کیا کہ استادِ محترم کو سبق دیا جائے۔ یہ بھاری ذمہ داری نشترؒ صاحب نے اپنے سر لے لی۔ اتفاق سے وہ وقت بھی جلد آ گیا۔ استاد صاحب کی عادت تھی کہ وہ طلبہ کی ہر اچھی بُری، صحیح یا غلط پر عادتاً کہا کرتا تھا: ''رائٹ''۔ ایک دفعہ مختلف موضوعات پر استاد صاحب سے طلبہ کا بحث مباحثہ جاری تھا کہ نشترؒ صاحب نے ازراہِ شرارت کہا: ''ہندومت دنیا کا بدترین مذہب ہے''۔ اُستاد نے عادتاً کہا: ''رائٹ''۔ یہ کہتے ہوئے اُستاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے پھر کبھی ''رائٹ'' کا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نشترؒ صاحب میں حسِ مزاح بھی تھی جس میں طنز کا رنگ بھی تھا۔ انہوں نے اُستادِ محترم کو چھیڑا بھی تو ہندومت کے حوالے سے۔ اسی سکول کا ایک اور واقعہ اُن کے ہم جماعت عبدالرحمٰن نے بیان کیا۔ اس سکول میں نشترؒ صاحب کا یہ پہلا دن تھا۔ ہیڈ ماسٹر کا پیریڈ تھا۔ جب وہ پڑھا کر چلے گئے تو ایک ہندو لڑکا جس کا نام جے

دیوتھا' اپنی سیٹ سے اُٹھا اور بلیک بورڈ پر چاک سے کچھ بنانے لگا۔ دو تین منٹ کے بعد اُس نے جماعت سے مخاطب ہو کر کہا: ''دیکھو یہ دس ڈلیاں ہیں۔ پہلی ڈلی سونے کی ہے' دوسری چاندی کی اور آخری مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ اس ڈلی کا نام اسلام ہے''۔ ہندو لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ نشترؒ صاحب اپنی سیٹ پر کھڑے ہو گئے اور بلند آواز میں بولے:-

''اگرچہ ہمیں مٹی پر فخر ہے لیکن جو انداز جے دیو نے اختیار کیا ہے' اُس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے متنبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی کوئی بات نہ کی جائے ورنہ ہمیں بھی جواب دینا آتا ہے''۔

نشترؒ صاحب کے ان الفاظ سے پوری کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد کسی ہندو نے کوئی بے ہودہ حرکت نہ کی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دورانِ قیام بھی اُن کی صلاحیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ علی گڑھ میں اکثر سیاسی و ادبی تقریبات اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ وہاں ہر فرقے اور گروہ کے سیاسی قائدین آتے رہتے تھے۔ ادیب اور شاعروں کا تو اکثر جمگھٹا رہتا تھا۔ اس میل جول سے اُن کے ادب کے ذوق اور شاعری کے شوق میں فراوانی اور پختگی پیدا ہوئی۔ زندگی کے ابتدائی پچیس برسوں میں یعنی زمانہ عنفوان شباب میں اُنہیں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم رہنماؤں کی مصاحبت و رفاقت حاصل رہی۔ سامراج دشمنی اُن کے خون میں تھی۔ زمانہ طالب علمی میں ان بزرگوں کے اثر سے دو آتشہ ہو گئی۔ وکالت کے ساتھ ساتھ سیاست کا شوق بھی پیدا ہوا۔ خداداد صلاحیت پہلے سے موجود تھی۔ حالات اور ماحول نے اسے جلا بخشی۔ انہوں نے ہمیشہ جب بھی قدم اُٹھایا' اُس سے مسلمانوں کو بالخصوص فائدہ ہی پہنچا۔ اُن کی کسی حرکت اور اقدام سے کبھی کسی مسلمان فرد اور مسلم قوم کو گزند نہیں پہنچا۔ نوجوانی میں تحریکِ خلافت میں عملی شرکت سے انہیں اُن مسائل سے آگاہی حاصل ہوئی جو مسلمانانِ ہند کو درپیش تھے اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے ظاہری اور پوشیدہ رویوں کا بھی اچھی طرح علم ہو گیا۔

نشترؒ صاحب کے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں:-

''کتنی دلچسپ بات ہے کہ جس چیز کو نشترؒ صاحب کے والد نے اپنے خاندان کے لیے مُضر سمجھا تھا' وہی چیز خاندان کے لیے وجہِ امتیاز بنی۔ اُن کے خاندان میں پشت ہا پشت سے سیاسی رقابتیں اور کش مکشیں چلی آ رہی تھیں جن کی وجہ سے خاندان کا استحکام اور خوشحالی بُری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ خاندان سیاسی جدوجہد سے پہلو بچا کر اپنے آپ کو خوب مضبوط کرے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے لڑکوں کو بار بار نصیحت کی کہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔ نشترؒ صاحب کے کانوں میں یہ الفاظ کئی بار پڑ چکے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ نشترؒ صاحب کے والد بزرگوار اپنے دوستوں کے ساتھ گھر کی طرف آ رہے تھے۔ اُنہوں نے دور سے دیکھا کہ جلسے کا ہنگامہ بپا ہے۔ وہ ذرا اور قریب چلے گئے۔ مقرر بہت پُر جوش تقریر کر رہا تھا۔ سننے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ ایک نظر مقرر کی طرف دیکھا۔ پھر اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دستوں نے پوچھا: ''یہ رونے کا کیا مقام ہے۔ دیکھو تو سہی' آپ کا نشترؒ کتنی پیاری تقریر کر رہا ہے''۔

کہنے لگے: ''یہ خوشی کے آنسو ہیں''۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ پھر کبھی اُنہیں تقریر کرنے سے نہیں روکا۔

نشترؒ صاحب کے بھائی عبدالغنی صاحب نے بتایا کہ میں نے نشترؒ صاحب سے پوچھا تھا کہ انہوں نے والد صاحب کی نصیحت کا لحاظ کیوں نہ رکھا۔ نشترؒ صاحب نے جواب میں کہا: ''میں ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ دادا صاحب سر پر کھڑے ہیں اور یہ مصرع پڑھ رہے ہیں: **''بکارِ خویش مردکارآشنا تنگ است''**

میں اس مصرع کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ مجھے میدانِ عمل میں کود پڑنے کا اشارہ دے رہے ہیں۔ چونکہ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسی جدوجہد میں گزرا تھا' اس لیے میں نے بھی یہ راستہ اختیار کر لیا''۔

☆ ☆ ☆

تحریکِ خلافت میں شمولیت

پہلی جنگِ عظیم کے بعد 1919ء میں انگریزوں نے ترکی پر قبضہ کیا اور اس کے حصے بخرے کیے تو خلافتِ عثمانیہ کی شکستگی پر مسلمانانِ ہند کو بہت دُکھ ہوا۔ بہت طیش آیا۔ جس وقت مصطفٰے کمال پاشا اور اُن کے ساتھی اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کی ہمدردی میں تحریکِ خلافت شروع کی جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس تحریک میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا حسرت موہانی جیسے اکابرین شریک تھے۔ تحریکِ خلافت نے تمام مسلمانوں کو نہ صرف متحد بلکہ پُر جوش بنا دیا۔ اس ہوش مندانہ تحریک میں جوش پیدا کرنے کے لیے ہزاروں نوجوان، اپنے بزرگوں کی سرکردگی میں طوفان اُٹھائے ہوئے تھے۔ ان جوشیلے نوجوانوں میں پشاور کا بیس سالہ نوجوان عبدالرب نشترؒ بھی شامل تھا۔

اُسی زمانے میں مارچ 1919ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی نے رولٹ ایکٹ پاس کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے۔ اس کے لیے حکومت نے یہ اختیار طلب کیا کہ وہ باغیوں اور اپنے دوسرے سیاسی مخالفین کو گرفتار کر کے جیوری کے مشورے کے بغیر اُن پر مقدمہ چلائے۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں شدید ردِعمل ہوا۔ قائداعظمؒ نے بطور احتجاج قانون ساز اسمبلی کی رُکنیت سے استعفٰی دے دیا۔ گاندھی نے بھی اس کی مذمت کی اور اُن کی اپیل پر 6 اپریل

1919ء کو اس ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں یومِ ستیہ گرہ منایا گیا۔ 13 اپریل 1919ء کو جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔ وہ بھی اسی عوامی احتجاج کی ایک کڑی تھا۔ اس عوامی احتجاج میں پشاور کے نوجوان بھی شامل تھے۔ عبدالرب نشترؒ اُن میں آگے آگے تھا۔

تحریکِ ترکِ موالات

اگلے برس 1920ء میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریکِ ترکِ موالات کا آغاز ہوا جسے تحریکِ عدم تعاون اور تحریکِ سول نافرمانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ حکومتِ برطانیہ سے تعاون کا ہر رشتہ رفتہ رفتہ توڑ لیا جائے۔ کیونکہ خلافتِ عثمانیہ، جزیرۃ العرب، سانحہ جلیانوالہ باغ، حقوقِ انسانی اور مطالبۂ آزادی کے متعلق انگریزوں کی حکمتِ عملی غلط تھی۔ حکومت سے عدم تعاون کی ابتدائی شقیں یہ تھیں: اعزازی عہدوں اور سرکاری خطابات کا ترک کرنا، سرکاری تقریبات میں شرکت سے احتراز، تمام سرکاری سکولوں اور کالجوں سے طلبہ کی بتدریج علیحدگی، سرکاری عدالتوں کا بتدریج مقاطعہ، بلدیاتی کونسلوں کے لیے رُکنیت اور ووٹ سے پرہیز، انگریزی مال کا بائیکاٹ۔ تمام ہندوستانی صرف دیسی کپڑا، خصوصاً ہاتھ کا کھدر پہنیں۔

اس پروگرام پر خلافت کمیٹی اور جمعیتِ العلمائے ہند نے اگست 1920ء سے عمل شروع کر دیا۔ ستمبر میں نیشنل کانگرس کا خصوصی اجلاس کلکتہ میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں بھی عدم تعاون کا پروگرام منظور کر لیا گیا۔ علماء نے باقاعدہ فتوے جاری کیے۔ ہزاروں لوگوں نے اپنے سرکاری خطابات واپس کر دیئے۔ طلبہ نے تعلیم کو خیرباد کہا اور قومی تحریک میں کام کرنے لگے۔ صرف کلکتہ میں تین ہزار طلبہ نے اپنے کالج چھوڑ دیے۔ لیکن اس تحریک میں بھی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ ہزاروں مسلمان اپنی نوکریاں چھوڑ کر فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے رفقا نے علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا اور جامعہ ملیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ کالج کی انتظامیہ نے تحریکِ عدم تعاون کی حمایت نہیں کی تھی ۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں شورش برپا ہوئی اور ادھر ہندو یونیورسٹی بنارس میں بالکل سکون رہا۔ جب مولانا محمد علی جوہر نے بنارس یونیورسٹی سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ وہ بھی تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے سرکاری گرانٹ لینا بند کر دیں تو وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ نے مولانا محمد علی جوہر کو بنارس یونیورسٹی میں تقریر کرنے کی بھی اجازت نہ دی۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری دور تھا جب ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا مگر یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا۔ ایک سال بھی نہیں چلا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی دل جوئی کے لیے ہر ممکن کوشش کی ۔ مسلمان رضا کاروں نے دسہرہ اور رام لیلا کا اہتمام کیا۔ مندروں میں جا کر بتوں کے حضور دعائیں مانگیں ۔ ویدوں کو الہامی کتاب تسلیم کیا۔ رامائن کی پوجا میں شرکت کی گئی ۔ مسلمانوں نے اپنے ماتھوں پر تلک لگائے ۔ دریائے گنگا پر پھول اور بتاشے چڑھائے گئے ۔ بار بار اعلان کیا گیا کہ (نعوذ باللہ) گاندھی نبوت کا مستحق ہے اور کہا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو (نعوذ باللہ) گاندھی نبی ہوتا۔ گائے کی قربانی بند کرنے کی تجاویز پیش کی گئیں ۔ جامع مسجد دہلی کے منبر پر ایک متشدد ہندو شردھانند سے تقریر کروائی جس نے بعد میں مسلمانوں کو شُدھ (دوبارہ ہندو) بنانے کی تحریک شدھی چلائی ۔

تحریکِ ہجرت

تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون سے جُڑواں ایک تیسری تحریکِ ہجرت بھی 1920ء کے دوران میں زور و شور سے چلی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہجرت کا فتویٰ جاری کیا جس میں جنگِ عظیم اول کے بعد مسلمانانِ ہند کے لیے ہجرت کو واجب قرار دیا گیا لیکن انفرادی ہجرت کو شرعی طور پر غیر صحیح بتلایا۔ ہجرت کا فتویٰ

جاری ہوتے ہی ہر شہر میں ناظم مقرر کیے گئے اور ''خُدام المہاجرین'' کے نام سے دہلی میں ایک مرکزی دفتر قائم کر دیا گیا۔ ابتداً اس تحریکِ ہجرت نے ایسا زور پکڑا کہ تحریکِ موالات بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ ہزاروں مسلمان اپنا مال و اسباب فروخت کر کے افغانستان کا رُخ کرنے لگے۔ جب سندھ سے 750 مہاجرین کا قافلہ بیرسٹر جان محمد جونیجو کی قیادت میں پشاور کی جانب روانہ ہوا تو اس ٹرین کا ہر سٹیشن پر خیر مقدم کیا گیا۔ خصوصاً پنجاب میں اس ٹرین نے ہجرت کے لیے جوش اور جذبے کی ایک لہر دوڑا دی۔ اگست 1920ء کے دوسرے ہفتے تک (جب تحریکِ خلافت اپنے عروج اور تحریکِ عدم تعاون اپنے شباب پر تھی) تیس ہزار سے زیادہ مسلمان افغانستان روانہ ہو گئے۔

پشاور اور مردان کے دیہاتی علاقوں میں بھی تحریکِ ہجرت نے زور پکڑا۔ یہاں کے ہندو زمیندار مسلمانوں کو ہجرت پر آمادہ کرنے لگے اور مسلمانوں کی زمینیں اور جائدادیں اونے پونے داموں خریدنے لگے۔ صوبہ سرحد میں جوش و خروش کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو وہاں قریہ قریہ کورس کی شکل میں گائے جاتے تھے۔

برباد ہوں، پروا نہیں
ناشاد ہوں، پروا نہیں
اے دوستو جو کچھ بھی ہو
کابل چلو، کابل چلو

ابتدا میں تو امان اللہ خان، والیٔ افغانستان نے بھی ہندی مسلمانوں کو خوش آمدید کہا لیکن بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر اپنی سرحدیں بند کر دیں۔ ادھر وہاں کے حالات کے پیشِ نظر مہاجرین بھی جلد ہی واپس آنے لگے جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تحریکِ ہجرت ایک جذباتی تحریک تھی جس کو ہندوستان کے اکثر و بیشتر علماء اور صائب الرائے زعما

نے ناپسند کیا۔ ان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف، حکیم اجمل خان وغیرہ شامل ہیں۔

ان تینوں معاصر تحریکوں کا ذکر قدرے تفصیل سے اس لیے کیا گیا ہے کہ سردار عبدالرب نشترؒ نے ان تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ 1919ء اور 1920ء میں جب تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا تو وہ پشاور کے کالج میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی ہر تقریب اور جلسے میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے 1922ء میں اپنے احباب کے تعاون سے پشاور میں ''مسلم لٹریری سوسائٹی'' قائم کی جس کا بنیادی مقصد اشاعتِ اسلام تھا۔ سوسائٹی کے تحت ''اسلامیہ کلب لائبریری'' بھی کھولی گئی۔ نشترؒ صاحب اس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریک

ہندوستان کی پوری تاریخ میں تحریکِ خلافت کا دور پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا مگر اس دور نے بہت کم عمر پائی۔ جونہی گاندھی جی نے تحریک بند کرنے کا اعلان کیا، ملک میں فتنہ وفساد کے دروازے کھل گئے۔ ہندوؤں نے مدراس میں موپلوں کی بغاوت (1921ء) کو جو سراسر انگریزوں کے خلاف تھی، اپنے اوپر فرقہ وارانہ حملہ قرار دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہندو مسلم فسادات کا ایک طویل اور خوفناک سلسلہ چل نکلا۔ 1922ء میں محرم کے موقع پر ملتان میں فساد ہوا۔ سب سے بڑا ہندو مسلم فساد 1924ء میں کوہاٹ میں ہوا۔ ہندو مسلم تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ 1923ء میں 11، 1924ء میں 18، 1925ء میں 16، 1926ء میں 35 اور 1927ء میں 73 ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔

ہندو مسلم تعلقات کو خراب کرنے کی ابتداء ہندوؤں کی جانب سے ہوئی۔ انہوں نے

پنڈت مدن موہن مالویہ' لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کی سربراہی میں سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں شروع کیں۔ سنگھٹن تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں میں باہم اتنا مضبوط اور مسلح اتحاد ہو جائے کہ وہ ہندوستان سے مسلمانوں کا قلع قمع کر سکیں۔ شدھی کا مطلب ہے پاک کرنا۔ یعنی وہ لوگ جو ہندومت ترک کر کے اسلام قبول کر چکے تھے' انہیں زبردستی دوبارہ ہندومت میں داخل کرنا۔ یہ دونوں تحریکیں 1922ء اور 1923ء میں اپنے عروج پر تھیں۔ سردار عبدالرب نشترؒ نے صوبہ سرحد میں ان متعصبانہ ہندو تحریکوں کو روکنے کے لیے جمعیتِ العلماء ہند اور تحریکِ خلافت کے صفِ اول کے رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا جس کے نتیجے میں انہوں نے پشاور میں ''ادارہ تبلیغِ اسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کو پشاور میں جمعیت العلماء ہند کی شاخ سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحکیم اس ادارے کے صدر اور نشترؒ صاحب سیکرٹری تھے۔

نشترؒ صاحب 1923ء میں وکالت کی ڈگری ایل ایل بی کی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان دو برسوں میں مولانا محمد علی جوہر سے انتہائی قریبی اور گہرا ربط ضبط پیدا ہو گیا۔ 1924ء میں مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت ہی کو ختم کر دیا تو مولانا محمد علی جوہر بہت اُداس اور مغموم رہنے لگے۔ بے شک اُن کی تحریکِ خلافت مرجھا گئی تھی لیکن اس کے بطن سے چند عظیم مسلمان رہنما پیدا ہوئے مثلاً مولانا ظفر علی خان' سید عطا اللہ شاہ بخاری' نواب محمد اسماعیل خان' مولانا عبدالحمید بھاشانی' سردار عبدالرب نشترؒ وغیرہ۔ نئے پُرجوش رہنماؤں کے علاوہ تحریکِ خلافت نے مسلمانانِ ہند میں ایک سیاسی شعور بھی پیدا کیا جس نے آگے چل کر تخلیقِ پاکستان کی راہ ہموار کی۔

مولانا جوہر اپنے مُرید یا شاگرد عبدالرب نشترؒ کو پیار سے ''سامری'' کہا کرتے تھے۔ نشترؒ صاحب نے مولانا سے بہت کچھ سیکھا اور کبھی کبھی دوران بحث الجھ بھی پڑتے تھے۔ ایسا ایک واقعہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں: اکثر مولانا محمد علی سے

بحث چھڑ جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1924ء میں وہ دہلی سے واپس آئے تو فرمانے لگے کہ دہلی میں مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے احیاء کے لیے جلسہ کیا تھا۔ مسلم لیگ تحریکِ خلافت کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی کیونکہ اُس کی پالیسی اعتدال پسندانہ تھی۔ مولانا جوہر نے کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے احیاء کی مخالفت کی۔ قائداعظمؒ اور اُن کے درمیان جو بحث ہوئی' اُس کی تفصیل سنائی۔ چنانچہ میں نے مسلم لیگ کی حمایت میں مولانا سے بحث چھیڑ دی۔ اتفاقاً ایک بات میں نے بحث میں ایسی کہہ دی جس سے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ لاجواب ہوگئے ہیں۔ چنانچہ فوراً اُٹھے اور میری گردن پر بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگے: ''سامری! آج تو نے ہمیں بھی پچھاڑ دیا''۔

1924ء ہی کا واقعہ ہے۔ ایک متنازعہ کتاب ''رنگیلا رسول'' ایک متعصب آریہ سماجی ہندو کتب فروش راج پال نے شائع کی تھی جس میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کے خلاف انتہائی ناشائستہ اور غیر مہذب زبان استعمال کی گئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مسلمانانِ ہند نے پورے ملک میں ناشر و مصنف راج پال کے خلاف سخت احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راج گوپال گرفتار تو ہوا لیکن عیسائی جج نے اُسے اس بناء پر رہا کر دیا کہ اس نوعیت کے جرم سے متعلق قانون میں کوئی شق نہیں ہے۔ اس واقعے سے قبل صوبہ سرحد کے مسلمان ایسے موقعوں پر مولانا محمد علی جوہر کی پیروی کیا کرتے تھے لیکن اس احتجاجی تحریک کے قائد مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ چنانچہ سردار نشترؒ نے بھی اُن کی پیروی میں احتجاجی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اُنہیں مسلمانوں کے تہذیبی' مذہبی' ثقافتی اور معاشی مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا اور دوسری طرف ہندوؤں کی ذہنیت کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے سیاسی نقطۂ نظر میں ابتداہی میں اعتدال اور پختگی آ گئی تھی۔

سردار عبدالرب نشترؒ کو ابتداہی سے سیاسی سرگرمیوں' جلسے جلوسوں میں حصہ لینے کا شوق

تھا۔مولانا محمد علی جوہر کی قریبی رفاقت سے اُن کا خطابت کا جوہر بھی کھل کر سامنے آ گیا تھا بلکہ اُن کی خطابت کا اسلوب بالکل مولانا جوہر پر گیا تھا۔کالج میں طالب علمی کے زمانے سے اُنہیں سٹیج اور تھیٹر کا بھی شوق تھا۔ہندوستانی فلمی دنیا کے مشہور اداکار پرتھوی راج بھی پشاور کے رہنے والے تھے اور سردار نشترؒ کے ہم جماعت تھے۔دونوں ڈراموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ایک دفعہ دہلی میں دونوں پرانے دوستوں کی ملاقات ہوئی تو پرتھوی راج نے نشترؒ صاحب سے کہا: ''قدرت نے تو ہم دونوں کو آرٹسٹ بنایا تھا۔آپ سیاست دان کیسے بن گئے''۔بات یہ ہے جس تعلیمی ادارے سے انہوں نے وکالت کی ڈگری حاصل کی تھی' اُس ادارے نے ایک نشترؒ ہی کو نہیں' بیسوں مشاہیر کو سیاست دان بنا کر بھیجا تھا جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک نصب العین دیا اور اُنہیں جدوجہد اور آزادی کی راہ دکھائی۔

نومبر 1927ء میں وائسرائے لارڈ ارون نے ایک کمیشن قائم کیا جس کے ارکان سات انگریز تھے اور اس میں ایک بھی ہندوستانی شامل نہیں تھا۔اس کا مقصد دستور کا جائزہ لینا اور اُس میں مناسب ترامیم کرنا تھا۔اس کے قیام سے تمام ملک میں اشتعال پیدا ہوا۔ تمام سیاسی جماعتوں میں نیشنل کانگرس' جمعیت العلمائے ہند' مرکزی خلافت کمیٹی' ہندو مہاسبھا' ہوم رول لیگ وغیرہ نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔البتہ آل انڈیا مسلم لیگ اس مسئلے پر دو حصوں میں بٹ گئی۔ایک حصہ قائداعظمؒ کی قیادت میں بائیکاٹ کا حامی تھا جبکہ دوسرا حصہ سر محمد شفیع کی قیادت میں بائیکاٹ کے خلاف تھا اور کہتا تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کے لیے کمیشن سے تعاون کرنا چاہیے۔اس وقت سردار نشترؒ خلافت کمیٹی کے بھی رُکن تھے اور نیشنل کانگرس کی رُکنیت بھی حال ہی میں حاصل کی تھی۔چنانچہ وہ بھی سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی تحریک میں شامل ہوئے۔سردار نشترؒ 1927ء سے 1931ء تک نیشنل کانگرس کے رکن رہے۔

سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے اہلِ ہند کو چیلنج کیا کہ اُن

میں آپس میں اس قدر اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ وہ خود کسی دستور کے اہل نہیں ہیں۔ چنانچہ اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو کی رہبری میں ایک دستوری کمیٹی بنائی۔ سر تیج بہادر سپرو، سر علی امام اور شعیب قریشی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ اس کمیٹی نے ''نہرو رپورٹ'' پیش کی اور دعویٰ کیا کہ اسے تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ رپورٹ تسلیم کیا جائے۔ مسلمانوں نے اس رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے اپنے ''چودہ نکات'' کی شکل میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ سردار عبدالرب نشترؒ نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی اور ''چودہ نکات'' کے حق میں تقریریں کیں۔

1927ء میں نشترؒ صاحب کی شادی پشاور کی ایک معزز اور دین دار شخصیت سید گل بادشاہ کی دختر اولیا بیگم سے ہوئی لیکن وہ خالص گھر گرھستن، پردہ دار خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی وکالت اور سیاست میں کسی بھی نوعیت کی رخنہ اندازی نہ کی۔

1929ء میں پہلی مرتبہ حکومتِ ہند نے صوبہ سرحد میں انتخابات کا اعلان کیا لیکن یہ انتخابات صرف پشاور میونسپل کمیٹی کی حدود کے لیے مقرر تھے۔ اس سے پہلے نامزدگیاں ہوتی تھیں۔ سرکاری اعلان ہوا کہ سولہ ارکان میں سے آٹھ منتخب ہوں گے اور آٹھ نامزد۔ نومبر 1929ء میں انتخابات ہوئے۔ خلافت کمیٹی نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ پانچ سیٹیں مسلمانوں کو، دو ہندوؤں کو اور ایک سیٹ سکھوں کو ملی۔ سردار عبدالرب نشترؒ خلافت کمیٹی کی طرف سے میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے اور مسلسل 1938ء تک رُکن رہے۔ جب 1935ء میں انتخاب ہوا فتح اُن کو نصیب ہوئی بلکہ 1932ء میں میونسپل کمیٹی پشاور کے نائب صدر بھی رہے۔

1930ء اپریل 23 کو صوبہ سرحد میں تحریکِ عدم تعاون کا آغاز ہوا۔ شراب کی دکانوں پر ہلّے بولے گئے۔ شراب کی بوتلیں سڑکوں پر انڈیل دی گئیں۔ لوگوں نے سرکاری اور پولیس کی گاڑیوں پر پتھراؤ کیا۔ ایک پتھر ڈپٹی کمشنر مسٹر براؤن کے ماتھے پر جا لگا۔

فائرنگ ہوئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں ایک احتجاجی اجتماع پر انگریزی فوج نے گولی چلا دی جس سے 30 افراد شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔

اُن دنوں سردار عبدالرب نشترؒ میونسپل کمیٹی کے رُکن تھے۔ اُنہوں نے اس بازار کا نام بدل کر ''بازار شہیداں'' رکھ دیا جس پر انگریز حکام سخت ناراض ہوئے۔ 23 اپریل کی شب کو سردار نشترؒ نے چیف کمشنر سر نورمن بولٹن سے ملاقات کی۔ بولٹن نے یقین دلایا کہ فائرنگ کا حکم میں نے نہیں دیا تھا۔ 25 اپریل کو بولٹن نے شہریوں کی ایک کانفرنس بُلائی جس میں نشترؒ صاحب نے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے:-

(1) تمام قیدیوں کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔

(2) ایک آزاد انکوائری کمیشن قائم کیا جائے جو پورے معاملے کی تحقیق کرے۔ ذمہ دار افسروں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

(3) شہیدوں اور زخمیوں کو معقول معاوضہ دیا جائے۔

(4) پولیس اور فوج کو واپس بلایا جائے۔

سر نورمن بولٹن نے یہ چاروں مطالبات تسلیم کر لیے۔ 25 اپریل ہی کو پولیس اور فوج پشاور شہر سے ہٹالی گئی۔ اُن کی جگہ رضا کار تعینات کر دیئے گئے لیکن انگریز حکومت نے بولٹن کا یہ فیصلہ اُن کی ذات کی کمزوری سمجھ کر معطل کر دیا۔ 30 اپریل کو اُن کا تبادلہ کر دیا گیا۔

انگریز حکومت نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر سخت جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ نشترؒ صاحب کو 4 مئی 1930ء کو گرفتار کیا گیا لیکن دو گھنٹے بعد رہا کر دیا گیا۔ اگلے روز 5 مئی کو دوبارہ گرفتار کر کے قلعہ بالا حصار میں محبوس کر دیا گیا۔ سردار نشترؒ نو ماہ تک ایسی کوٹھڑی میں قید رہے جہاں روشنی تھی نہ ہوا کا گزر تھا۔ ایک معمولی بلب اور پنکھا تک نہ تھا اور اس کوٹھڑی میں صرف وہی نہیں تھے بلکہ تیرہ قیدی اور بھی ٹھنسے ہوئے تھے۔ کسی سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ میونسپل کمیٹی کے رُکن اور شہر کے مشہور وکیل سردار عبدالرب نشترؒ نو ماہ کی قید کے بعد

جنوری 1931ء میں رہا ہوئے۔ اُن کا بڑا بیٹا جمیل نشتر جب پیدا ہوا تو اس وقت اُس کے والد جیل میں تھے۔

1931ء میں نشترؒ صاحب نے نیشنل کانگرس سے اس لیے استعفیٰ دے دیا کہ خان عبدالغفار خان کا رویہ بہت سخت ہوگیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہر کانگرسی اُن کے احکام و ہدایات پر سختی سے عمل کرے۔ اُن کے رویے کی وجہ سے اکثر مخلص اور بے غرض کارکن کانگرس سے مستعفی ہوگئے۔ بعض حضرات پنڈت نہرو کے سمجھانے بجھانے پر واپس کانگرس میں آگئے لیکن سردار نشترؒ نے واپس آنا گوارا نہ کیا حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کئی بار اُنہیں منانے کی کوشش کی لیکن اُن کا دل ہمیشہ کے لیے کانگرس کی طرف سے بد دِل ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

1937ء کے انتخابات

صوبہ سرحد کی سیاسی حالت دوسرے صوبوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس صوبے کے عوام قیادت کا بحران ہونے کی وجہ سے سیاسی طور پر فعال نہیں تھے۔ نیشنل کانگرس کی جڑیں سرخ پوشوں کے غیر مشروط تعاون کی وجہ سے بہت گہری تھیں۔ صوبے میں دو گروپ تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار اور خان' متوسط اور غریب طبقہ۔ دوسرے گروپ کی ہمدردیاں نیشنل کانگرس کے ساتھ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ برطانوی سامراج کے خلاف کوئی جماعت جدوجہد کر رہی ہے تو وہ فقط نیشنل کانگرس ہے۔ اُس وقت تک مسلم لیگ کا نام ونشان تک نہ تھا اور اگر تھا تو برائے نام' اور وہ بھی چند اہلِ قلم اور صحافیوں کے دم قلم سے۔ صرف ایک مختصر سی تنظیم ''مسلم ایسوسی ایشن'' تھی جو سر صاحبزادہ عبدالقیوم نے قائم کر رکھی تھی جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی تھی۔ دستور ساز اسمبلی کی حد تک سر قیوم نے ''آزاد مسلم پارٹی'' بنا رکھی تھی جسے چند مسلم ارکان کی تائید حاصل تھی۔ سر قیوم مسلمانوں کے ممتاز لیڈر تھے۔ انگریزوں سے بھی اُن کے قریبی تعلقات تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مفادات کے لیے بہت کام کیے اور کانگرس کے عزائم کو ناکام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ 1932ء میں گول میز کانفرنس میں صوبہ سرحد کے لیے آئینی اصلاحات منظور کرانے میں قائداعظمؒ کے بعد سر قیوم کا بھی بڑا کردار تھا۔

پچھلے سال کے ہنگاموں کی وجہ سے جن مشہور لوگوں کو قید کیا گیا تھا' اُنہیں مارچ 1931ء میں رہا کر دیا گیا جن میں خان عبدالغفار خان بھی شامل تھے۔ اب وہ ذہنی طور پر انگریزی سامراج اور حکومت کے خلاف سرگرمیاں زیادہ شدت سے چلانے کے لیے بالکل

تیار تھے۔ چنانچہ اس طرح سرخ پوشوں کی تحریک قائم کرنے کا راستہ ہموار ہوگیا۔ خان صاحب کو کانگرس کے پروپیگنڈے سے فائدہ پہنچا لیکن انہوں نے اپنے حسنِ تدبیر سے کانگرس سے مستفید ہوتے ہوئے اپنی سرخ پوش تحریک کو کانگرس سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی لیکن پشاور کے کانگرسی مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ غفار خان یا تو سو فی صد کانگرسی بن جائیں یا سو فی صد اپنی پارٹی کو منظم کریں لیکن غفار خان بیک وقت دونوں کشتیوں میں سوار رہنا چاہتے تھے کیونکہ سرخ پوش تحریک کو تقویت پہنچانے کا یہ واحد طریقہ تھا کہ کانگرس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ جب سے علی برادران نے کانگرس سے اپنا دامن چھڑایا تھا' ہندوؤں کی خواہش اور کوشش تھی کہ یہ مقام خان برادران (ڈاکٹر خان صاحب اور غفار خان) کو دے دیا جائے تاکہ صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی تائید وحمایت حاصل رہے۔

پشاور کے بعض معززین کی فرمائش پر قائداعظمؒ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم سازی کے لیے 18 اکتوبر 1936ء کو پشاور تشریف لائے۔ انہوں نے آئندہ تین دنوں میں شاہی باغ' اسلامیہ کالج اور ایڈورڈز کالج میں عوامی جلسوں سے خطاب کیا اور انہیں آپس کے اختلافات بھلا کر مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد و منظم ہونے کی تلقین کی۔ سردار عبدالرب نشترؒ ان جلسوں کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی مخالفت کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں نے کی تھی لیکن اس کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کے لیے دونوں جماعتیں تیار ہوگئیں۔ دسمبر 1936ء میں فرنٹیئر اسمبلی کے امیدواروں کے لیے نامزدگی ہوئی۔ سب سے بڑی جماعت نیشنل کانگرس تھی لیکن چونکہ اُس پر قانونی پابندی عائد تھی' اس لیے اُس نے انتخابات میں ''پراونشیل پارلیمانی بورڈ'' کے نام سے شرکت کی۔ سرخ پوش تحریک نے بھی کانگرس کے شریک کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کانگرس نے سردار نشترؒ پر زور دیا کہ وہ کانگرس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا' البتہ انہوں

نے یقین دلایا کہ ''جب بھی کانگرس برطانوی حکومت کے خلاف کوئی اقدام کرے گی تو میں کانگرس کا ساتھ دوں گا' یہ دوسری بات ہے کہ میں کانگرس کی پالیسیوں کے خلاف ہوں۔''

صوبہ سرحد کے شہروں اور بڑے قصبوں میں سیاسی اثر و رسوخ وکیلوں کو حاصل تھا۔ اُس زمانے میں سب سے بارسوخ اور معروف وکیل ملک خدا بخش اور پیر بخش تھے۔ وہ پرانی قانون ساز اسمبلی میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے شامل تھے۔ اُن کے بعد آنے والے دو وکیل' جنھوں نے تحریکِ پاکستان میں شہرت حاصل کی' خان عبدالقیوم خان اور سردار عبدالرب نشترؒ تھے۔ اُس وقت خان قیوم کانگرس کے نمائندے تھے اور سردار نشترؒ آزاد۔ وہ کانگرس چھوڑ چکے تھے لیکن ابھی مسلم لیگ میں شرکت نہیں کی تھی اور صوبائی اسمبلی میں آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے کانگرس کی حمایت کرتے تھے۔

1937ء کے انتخابات کے بعد' جو دسمبر 1936ء میں ہوئے تھے' سردار عبدالرب نشترؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی رُکنیت اختیار کی اور پہلی بار مارچ 1937ء میں دہلی میں منعقدہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کی۔ انہوں نے اس اجلاس میں تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کے آئین پر نظرِ ثانی ہونی چاہئے اور اس کا نصب العین اور ہدف مکمل آزادی ہونی چاہئے۔

یومِ نجات (22 دسمبر 1939ء)

1937ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں نیشنل کانگرس نے چھ صوبوں مدراس' یوپی' سی پی' بہار' اڑیسہ اور بمبئی میں حکومت قائم کر لی۔ چار مسلم اکثریتی صوبوں میں سے صرف بنگال میں مسلم لیگی وزارت قائم ہو سکی۔ کانگرسی حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی مسلم دشمنی پر مبنی ایسے اقدامات کیے جن سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی۔ چند اقدامات یہ تھے:- اسمبلیوں' ڈسٹرکٹ بورڈ' میونسپل کمیٹیوں حتیٰ کہ سکولوں اور کالجوں میں ''بندے ماترم'' گایا

گیا۔ کانگرس کا ترنگا جھنڈا سرکاری طور پر قومی پرچم قرار دیا گیا۔ واردھا تعلیمی سکیم نافذ کی گئی۔ تمام صوبوں میں ہندی زبان نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ کانگرس کے صدر سے لے کر ایک معمولی کارکن تک سبھی اقتدار کے نشے میں یہ سمجھنے لگے کہ اب مسلمانوں سے ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کا وقت آن پہنچا۔

کانگرس کی اس متشددانہ پالیسی نے مسلمانانِ ہند کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ متحدہ ہندوستانی قوم کا کانگرسی دعویٰ بے معنی ہے۔ کانگرس کی اس متعصبانہ پالیسی سے خود کانگرس بدنام ہوگئی۔ مسلمانوں میں کانگرس سے نفرت پیدا ہوئی اور مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت میں روز بروز ترقی ہوئی۔ 1939ء میں جب کانگرس اور مسلم لیگ کی یہ کشمکش عروج پر تھی تو دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوگیا۔ برطانیہ نے ہندوستان کو اس جنگ میں شامل کرنے کے لیے وفاقی دستور کا نفاذ التواء میں ڈال دیا۔ کانگرس نے احتجاج کے طور پر اپنے صوبوں کی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا' صوبہ سرحد کی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت نے 7 نومبر 1939ء کو استعفیٰ گورنر کو پیش کر دیا۔

کانگرس کے اس فیصلے کا مسلمانوں پر بڑا خوشگوار ردِعمل ہوا۔ قائداعظمؒ نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ اپنی اجتماعی خوشی کے لیے 22 دسمبر 1939ء کو ''یومِ نجات'' منایا جائے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اُس دن ہندوستان کے طول وعرض میں صوبائی' ضلعی اور پرائمری لیگوں نے عوامی جلسے منعقد کیے۔ نماز جمعہ کے اجتماعات میں نماز شکرانہ بھی ادا کی گئی۔ صوبہ سرحد میں ''یومِ نجات'' کی تقریبات کا اہتمام و انصرام انتہائی خوش اسلوبی سے سردار عبدالرب نشترؒ کی رہبری میں کیا گیا۔

مسلم لیگی وزارت میں شمولیت

سردار اورنگ زیب صوبہ سرحد کے ایک عظیم رہنما تھے۔ اُن کی قیادت میں سردار

عبدالرب نشترؒ نے پہلے ہی مسلم لیگ کی زبردست خدمت کی تھی۔ کانگرس نے جب ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی ایک بڑی تحریک شروع کی' اُس وقت صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت باقی نہ رہی۔ یہاں بھی وزارت سے کانگرس مستعفی ہو چکی تھی اور صوبہ سرحد میں گورنر راج قائم تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کو دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت سے وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ سردار اورنگ زیب نے اسمبلی میں اکثریت حاصل بلکہ جمع کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے سردار نشترؒ سے بھی کہا کہ وزارت میں شامل ہونے کی تیاری کریں لیکن سردار نشترؒ لیگی وزارت بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حالات ناسازگار ہیں۔ آٹے کا قحط ہے' کپڑا نہیں ملتا' قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ پھر ہمیں ایسی مضبوط اکثریت نہیں مل سکتی کہ سکون سے حکومت کی جا سکے۔ ایسے حالات میں لیگی حکومت صرف یہی نہیں کہ ناکام ہو جائے گی بلکہ بدنام ہو جائے گی لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے 31 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل 1943ء دہلی میں فیصلہ ہوا کہ صوبہ سرحد میں وزارت بنائی جائے۔ سردار نشترؒ بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ چنانچہ 23 مئی 1943ء کو مسلم لیگی وزارت نے حلف اُٹھایا۔ وزیروں کے نام یہ تھا: سردار اورنگ زیب (وزیر اعلیٰ)' سردار عبدالرب نشترؒ (وزیرِ خزانہ)' محمد عثمین جان (وزیرِ تعلیم) عبدالرحمٰن خان (وزیرِ اطلاعات) سردار اجیت سنگھ (وزیرِ تعمیرات)۔ یہ وزارت صرف 22 مہینے قائم رہ سکی۔

جنوری 1944ء میں سردار عبدالرب نشترؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا رُکن بنایا گیا۔

یکم اپریل 1944ء کو سیالکوٹ میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اُس وقت پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ وزیر اعلیٰ خضر حیات خان ٹوانہ نے وہاں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نہ بننے دی اور دوسرے طریقوں سے بھی اُس نے مسلم لیگ سے غداری کی۔ اس پر صوبائی مسلم لیگ نے ایک کانفرنس سیالکوٹ میں طلب کی' جس کی

صدارت کے لیے سردار عبدالرب نشترؒ کو مدعو کیا گیا۔ سردار نشترؒ کی صدارت میں اس شاندار کانفرنس نے پنجاب کی سیاست میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسی کانفرنس کے موقع پر سردار نشترؒ نے قائداعظمؒ کو (انگریزی میں) خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:-

''قائداعظمؒ اس قدر ذہین ہیں
کہ کوئی اُنہیں دھوکہ نہیں دے سکتا
وہ اس قدر بہادر ہیں
کہ کوئی انہیں مرعوب نہیں کر سکتا
وہ اس قدر بے لوث ہیں
کہ کسی قسم کا لالچ اُنہیں گمراہ نہیں کر سکتا''

اس کانفرنس سے قائداعظمؒ کو بھی خطاب کرنا تھا لیکن وہ دوسرے روز تشریف لائے۔ بقول نشترؒ: ''اس التوا کا مقصد یہ تھا تا کہ میری تقریر کو زیادہ وزن حاصل ہو جائے۔''

دوسرے روز قائداعظمؒ نے حسبِ معمول انگریزی میں تقریر کی جس کا اُردو ترجمہ سردار نشترؒ نے کیا۔

جنوری 1945ء میں مرکزی حکومت نے نشترؒ صاحب کو دہلی میں ایک ٹرانسپورٹ کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ مارچ 9 تا 12 صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں مسلم لیگ کی وزارت کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کی گئی جو 18 کے مقابلے میں 24 ووٹوں سے کامیاب ہوگئی۔ تحریک کی تائید کرنے والے مسلم لیگی لیڈر سعداللہ خان بھی تھے۔ وزارت نے 16 مارچ کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی وزارت تشکیل کی۔

☆ ☆ ☆

صوبائی انتخابات (1946ء)

جون 1945ء کی ''شملہ کانفرنس'' سیاسی مصالحت کرانے میں اس لیے ناکام رہی کہ اُس وقت کانگرس اور مسلم لیگ اپنی نمائندہ حیثیت کے متعلق جو دعوے کر رہی تھیں' اُن کی تصدیق کرنا ممکن نہیں تھا۔ اِس کوتاہی کو وائسرائے لارڈ ویول نے 21 اگست 1945ء کو اپنے دو اہم اعلانات کے ذریعے دُور کر دیا۔ پہلا اعلان یہ تھا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات آئندہ موسمِ سرما میں منعقد کیے جائیں گے۔ دوسرا اعلان یہ تھا کہ انتخابات کے بعد ایک آئین ساز اسمبلی قائم کی جائے گی۔

یہ انتخابات آسان ترین سیاسی بنیادوں پر لڑے گئے۔ مسلم لیگ اس لیے لڑ رہی تھی کہ یہ ثابت کر سکے کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے منشور کا خلاصہ دو جملوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل پاکستان کا قیام ہے۔ دوسری طرف نیشنل کانگرس کا مؤقف اس کے برعکس تھا۔ کانگرس کا دعویٰ تھا کہ کانگرس تمام ہندو' مسلمانوں' سکھ' عیسائیوں اور تمام ہندوستانی باشندوں کی نمائندہ ہے اور ہندوستان ایک واحد نا قابلِ تقسیم ملک ہے۔

انتخابات دو مرحلوں میں ہوئے۔ مرکزی اسمبلی کا انتخاب دسمبر 1945ء میں ہوا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی تیس نشستیں تھیں۔ ان سب نشستوں پر مسلم لیگ کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ اس الیکشن کے بعد پوری اسمبلی کی ترکیب یوں ہوئی: مسلم لیگ 30' کانگرس 57' آزاد 5' اکالی سکھ 2 اور یورپی 8۔ منتخب نشستوں کی کل تعداد 102

تھی جو اس طرح پوری ہوگئی ۔ الیکشن سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان میں سب سے بڑی نمائندہ انجمنیں صرف دو ہیں ۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے اور کانگرس ہندوؤں کے لیے ۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے بعد صوبوں میں انتخابی عمل شروع ہوا۔ مختلف صوبوں میں الگ الگ تاریخوں پر انتخابات ہوئے ۔ تاہم فروری 1946ء کے دوران صوبائی انتخابات بھی مکمل ہوگئے ۔ صوبہ سرحد میں انتخابات کے موقع پر ایک خاص واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ کانگرس کے ڈپٹی لیڈر خان عبدالقیوم خان نے چار اکتوبر 1945ء کو کانگرس سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کردیا۔ سردار نشترؒ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں: ''میں عرصۂ دراز سے خان صاحب سے اصرار کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کریں ۔ اُنہیں خان عبدالغفار خان پسند نہیں کرتے تھے لیکن ڈاکٹر خان صاحب سے اُن کے تعلقات بہت دوستانہ اور خوشگوار تھے ۔ اُنہیں امید تھی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی مہربانی سے اُنہیں کانگرس کا ٹکٹ مل جائے گا لیکن جب یہ اُمید ٹوٹ گئی تو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی ۔''

صوبہ سرحد کے مسلم لیگی قائدین میں اتحاد نہیں تھا۔ اورنگ زیب نے قائداعظمؒ سے سردار نشترؒ کی شکایت کی کہ وہ اتحاد میں رخنہ اندازی کررہے ہیں ۔ خان عبدالقیوم خان الگ اپنی سی کوشش کررہے تھے کہ ایسے امیدوار کامیاب نہ ہونے پائیں جو اسمبلی میں اُن کے مقابل آکر پارٹی کی قیادت کرسکیں ۔ انہی وجوہ سے سردار نشترؒ نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کردیا تاکہ مسلم لیگ میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہ ہو۔ قائداعظمؒ نے ایک تار کے ذریعے نشترؒ صاحب کو تاکید کی کہ وہ الیکشن میں ضرور حصہ لیں ۔ اپنے قائد کے حکم کے بموجب سردار نشترؒ نے مسلم لیگ کا ٹکٹ لے لیا۔

اب صورتِ حال کچھ یوں بن گئی تھی کہ شہر پشاور کے حلقۂ انتخاب میں نشترؒ صاحب اور عبدالقیوم خان مسلم لیگ کے دو امیدوار تھے ۔ اُس وقت ہر ووٹر کو دو ووٹ دینے کا حق تھا۔

ووٹر کو اس بات کا اختیار تھا کہ وہ چاہے تو دونوں ووٹ ایک ہی امیدوار کو دے سکتا ہے اور چاہے تو ایک ووٹ ایک امیدوار کو اور ایک ووٹ دوسرے امیدوار کو۔ ان دونوں امیدواروں میں یہ طے ہوا تھا کہ ایک ووٹ عبدالقیوم خان کو اور ایک ووٹ نشترؒ صاحب کو دیا جائے گا۔ پولنگ کے وقت چند احباب نشترؒ صاحب کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ ووٹر دونوں ووٹ قیوم خان صاحب کے حق میں ڈال رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی اپنے ووٹروں سے دونوں ووٹ آپ کے حق میں ڈلوائیں؟ نشترؒ صاحب نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا اور سختی سے کہا: ''ہوسکتا ہے یہ خبر سرے سے غلط ہو۔ اگر صحیح بھی ہے تب بھی ہم اپنے اصول اور عہد پر قائم رہیں گے۔ سیاسی تربیت کے لیے فتح اور شکست دونوں ضروری ہیں''

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ سردار عبدالرب نشترؒ اس الیکشن میں ہار گئے۔

صوبہ سرحد میں 38 مسلم نشستوں میں سے 17 پر مسلم لیگی نمائندے جیتے، جبکہ دو جمعیت العلماء ہند کے اور تین آزاد اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ 50 ارکان کے ایوان میں 30 سیٹیں کانگرس کے پاس تھیں جن میں خدائی خدمت گار بھی شامل تھے۔ کانگرس کو مخلوط وزارت بنانے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ چنانچہ گورنر سر جارج کنگھم نے خدائی خدمت گار ڈاکٹر خان صاحب کو کانگرسی وزارت بنانے کی دعوت دی۔ کانگرسی ارکان نے غیر مسلم لیگی ارکان کے تعاون سے ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں چار رکنی کابینہ بنائی جو قیامِ پاکستان کے بعد چند روز تک برسر اقتدار رہی۔

عبوری حکومت میں شمولیت

مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور کے بعد مسلمانانِ ہند نے اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے جو منزل مقرر کی تھی، اُس کی جانب چلنے کی رفتار میں انتخابات کے بعد بہت تیزی آ گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اِن انتخابات نے ملک کی سیاسی صورتِ حال کو واضح کر دیا۔

اب حکومتِ برطانیہ کو پہلی بار سنجیدگی سے احساس ہوا کہ ہندوستان کے سیاسی تعطل کو دُور کرنے کے لیے اور کوئی نیا آئینی نظام دینے کے لیے جلد ہی کوئی ٹھوس قدم اُٹھانا ضروری ہے۔ چنانچہ 19 فروری 1946ء کو برطانوی وزیراعظم لارڈ ایٹلی نے تین وزراء پر مشتمل ایک ''وزارتی مشن'' ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ اس مشن کے سربراہ لارڈ پیتھک لارنس (وزیرہند) اور بقیہ دو ارکان سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزنڈر تھے۔ اس مشن کے ارکان نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کے صدر قائداعظمؒ سے خطوط کا تبادلہ بھی ہوا۔ بعض معاملات کی شرح اور وضاحت اور گفتگو کے لیے وزارتی مشن کی فرمائش کے مطابق دونوں بڑی جماعتوں کی جانب سے چار چار نمائندوں کے نام پیش کیے گئے۔ مسلم لیگ نے اپنے چار بڑے نام وزارتی مشن کو دیے: قائداعظمؒ نواب محمد اسماعیل خان' نواب زادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشترؒ۔

دونوں جماعتوں کے نمائندوں سے مذاکرات اور گفت وشنید کے بعد وزارتی مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ برصغیر کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ گروپ ''اے'' میں یوپی' سی پی' بہار' اڑیسہ' بمبئی اور مدراس کے صوبے شامل ہوں۔ گروپ ''بی'' میں پنجاب' سندھ' صوبہ سرحد اور گروپ ''سی'' میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل ہوں اور نئے آئین کے نفاذ سے قبل ایک عبوری حکومت قائم کی جائے۔ وزارتی مشن کے اس منصوبے کو مسلم لیگ نے مکمل طور پر منظور کر لیا جبکہ کانگرس نے اسے جزوی طور پر منظور کیا۔ 29 جون 1946ء کو وزارتی مشن اپنی ناکامی کے بعد واپس لندن چلا گیا۔

جولائی 1946ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کو نیشنل کانگرس کا صدر مقرر کیا گیا تو اُنہوں نے ''وزارتی کی رہی سہی اُمیدوں پر یہ شرط لگا کر پانی پھیر دیا کہ جب اور جہاں کانگرس کی اکثریت ہوگی' وہ اس منصوبے پر عمل درآمد کی پابند نہیں

ہوگی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے مجبور ہوکر 27 جولائی کو وزارتی مشن کی اپنی منظوری کا فیصلہ واپس لے لیا اور 16 اگست 1946ء کو یومِ راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن ڈے) منانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے حق میں انتہائی مفید اور سازگار ثابت ہوا۔

ادھر انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی بدعہدی کی ایک اور مثال قائم کرتے ہوئے کانگرس کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی حالانکہ اُس نے وزارتی مشن کا منصوبہ تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ کانگرس کے عبوری حکومت میں شامل ہونے کو قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھا۔ اس موقع پر نواب بھوپال نے گاندھی جی کے ساتھ گفتگو کی اور انہوں نے ایک فارمولا طے کیا جس سے مسلم لیگ کے اعتراضات رفع ہوگئے۔ اب مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا گیا۔ مسلم لیگ نے اپنے پانچ مندرجہ ذیل نمائندے عبوری حکومت میں شمولیت کے لیے نامزد کیے۔ جن کے محکمے وائسرائے نے مقرر کیے:-

1) نواب زادہ لیاقت علی خان (خزانہ)
2) آئی آئی چندریگر (تجارت)
3) سردار عبدالرب نشترؒ (مواصلات)
4) راجہ غضنفر علی خان (صحت)
5) جگندر ناتھ منڈل (آئین و قانون)

پارٹیشن کونسل میں شمولیت

لیڈروں کی اُس کانفرنس میں جس نے 3 جون 1947ء کا منصوبہ تیار کیا تھا' لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 33 صفحات کی ایک دستاویز ہر جماعت کے رہنما کو دے دی تھی۔ اس کا

عنوان تھا: ''تقسیمِ ہند کے انتظامی نتائج''۔ اس دستاویز کی رو سے ایک ''پارٹیشن کمیٹی'' مقرر کردی گئی جس کے ارکان سردار پٹیل، راجندر پرشاد، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشترؒ اور صدر ماؤنٹ بیٹن تھے۔ جب صوبوں نے تقسیم کا فیصلہ کر دیا تو یہ کمیٹی پارٹیشن کونسل بن گئی۔

☆ ☆ ☆

قیامِ پاکستان کے بعد

14 اگست 1947ء کو پاکستان ہندوؤں اور انگریزوں کی مسلسل اور شدید مخالفت کے باوصف وجود میں آیا۔ ہندوؤں نے پاکستان کا قیام بادلِ نخواستہ منظور کر لیا تھا لیکن ہندو لیڈر ابھی تک اس فریب میں مبتلا تھے کہ پاکستان ایک بار پھر ہندوستان کا حصہ بن جائے گا۔ نیشنل کانگرس کے بڑے بڑے لیڈرز گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ اپنے ان ارادوں کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے تو انہوں نے پاکستان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کیں اور پاکستان کو ختم کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔

حصولِ آزادی کے وقت سردار عبدالرب نشترؒ غیر منقسم ہندوستان کے وزیرِ مواصلات تھے۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی وزارت میں اسی منصب پر کام کرتے رہے۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 10 اگست 1947ء کو اتوار کو اسمبلی چیمبر، کراچی میں منعقد ہوا۔ نشترؒ صاحب نے اسمبلی کے صدر کے انتخاب کے لیے خصوصی قواعد بنانے کی قرارداد پیش کی جو اسمبلی نے معمولی ترمیم کے بعد منظور کر لی۔ نشترؒ صاحب نے صدر اسمبلی کے جانب سے ایک ایسی کمیٹی تشکیل دینے کی تجویز پیش کی جو اسمبلی کی کارروائی کے لیے قواعد وضوابط، صدر کے اختیارات اور اسامیاں پُر کرنے کے قواعد مرتب کرے۔ یہ تجویز بھی جو نشترؒ صاحب نے قرارداد کی صورت میں پیش کی تھی، اسمبلی نے منظور کر لی۔ جب لیاقت علی خان نے یہ قرارداد پیش کی کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر اور پاکستان کے گورنر

جنرل کو تمام سرکاری قوانین، دستاویزات اور خط و کتابت میں 15 اگست 1947ء کے بعد ''قائداعظم محمد علی جناحؒ'' لکھا جائے تو مشرقی بنگال کے ایک رُکن بھوپر رکماردت نے قرارداد کی مخالفت کی تو سردار عبدالرب نشترؒ نے کھڑے ہو کر سخت لہجے میں دت صاحب سے پوچھا کہ آخر کس وجہ سے آپ اِس سادہ سی قرارداد کی مخالفت کر رہے ہیں۔ کسی اور ممبر نے مخالفت نہیں کی تھی، اس لیے وہ قرارداد منظور ہو گئی۔

لیاقت علی خان نے تجویز کیا کہ ایک کمیٹی اِس مقصد کے لیے تشکیل دی جائے کہ پاکستان کے شہریوں کے بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے امور کے بارے میں اسمبلی کو مشورے دیا کرے۔ سردار عبدالرب نشترؒ اس کمیٹی میں شامل تھے۔ اِس کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے چیئرمین سر ظفر اللہ خان اور اقلیتی امور کی سب کمیٹی کے چیئرمین سردار عبدالرب نشترؒ تھے۔

وزارت اور مختلف کمیٹیوں کی صدارتی ذمہ داریوں اور اسمبلی کی فعال اور سرگرم رُکنیت کے علاوہ نئے ممالک کو پیش آمدہ شدید مسائل بالخصوص ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات کے مسائل سے نمٹنے کے لیے بھی سردار نشترؒ پیش پیش تھے۔ اُنہوں نے گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور مشرقی پنجاب میں فیروز پور، جالندھر، موگہ اور لدھیانہ کے دورے کیے اور پُرامن حالات قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1947ء کے فسادات، نقل و حمل، رسل و رسائل، ریلوے اور ڈاک کے نظام کی ابتری کے باعث پورا مواصلات کا انتظام ابتر ہو گیا تھا لیکن سردار نشترؒ نے وزیرِ مواصلات کی حیثیت سے مواصلات کا نظام تباہ نہیں ہونے دیا اور ایک سال کے بعد حالات اتنے استوار کر لیے کہ محکمہ ریلوے اور ڈاکخانہ جات میں اُردو نافذ کر دی۔ ریلوے ٹائم ٹیبل، ٹکٹ اور ڈاک کے ٹکٹ اُردو میں چھپوانے کا اہتمام کیا۔

سردار عبدالرب نشترؒ نے ''مشترکہ ڈیفنس کونسل'' کے اجلاس منعقدہ 8 ستمبر 1947ء میں وزیراعظم کی جگہ نیابت کی۔ کونسل کے اس اجلاس میں لوگوں کی ہجرت اور نقل مکانی

سے پیدا ہونے والے مسائل پر غور کیا گیا اور مناسب انتظامی فیصلے کیے گئے۔ نومبر 1947ء میں دوبارہ ''مشترکہ ڈیفنس کونسل'' میں شرکت کی جس میں کشمیر کے مسئلے پر غور و خوض ہوا تھا۔

اسمبلی کے صدر یعنی قائداعظمؒ کی عدم موجودگی میں اسمبلی کے صدارتی اختیارات و فرائض کی انجام دہی کے لیے بارہ افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ سردار عبدالرب نشترؒ اس کمیٹی کے بھی رُکن تھے۔

دستور ساز اسمبلی میں سب سے زیادہ کام نشترؒ صاحب نے کیا۔ وہ اسلام اور پاکستان سے عشق کرتے تھے۔ وہ ''قرار دادِ مقاصد'' کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیتے تھے۔ ایک مرحلہ آیا کہ دستور ساز اسمبلی کے اراکین میں اس بات پر سخت اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا پاکستان کے صدر کے لیے مسلمان ہونے کی شرط لگانا ضروری ہے۔ دونوں طرف سے زوردار تقریریں ہوئیں۔ معاملہ طول پکڑ گیا۔ اس نازک موقع پر نشترؒ صاحب کی جرأت مندانہ اور ایمان افروز تقریر نے رنگ بدل دیا اور صدر پاکستان کے لیے مسلمان ہونا ضروری قرار پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ الطاف حسن قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں نشترؒ صاحب کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس تحریک کو وہ اسلامی اور عوامی رنگ دیا جو تحریکِ خلافت کی پہلی اور امتیازی خصوصیت تھی۔ اگر نشترؒ صاحب کے ذہن کے لوگ مسلم لیگ کو میسر نہ آتے تو اس تحریک کا مزاج یقیناً کچھ اور ہوتا۔ تحریکِ پاکستان کو عام مسلمانوں کے دل کی آواز بنا دینے میں نشترؒ صاحب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ وہ گاؤں گاؤں گئے۔ شہروں اور قصبوں میں لاکھوں مسلمانوں سے خطاب کیا اور ایسی سحر انگیز تقریریں کیں کہ سامعین دل تھام کر رہ گئے اور انہوں نے اپنا سب کچھ پاکستان کے لیے نچھاور کر دینے کا عہد کر لیا۔ وہ اسلام کا پیغام لے کر برصغیر کے کونے کونے تک پہنچے اور مردہ اور

بے جان مسلمانوں میں زندگی کی آرزو پیدا کردی۔ مسلم لیگ نشترؒ صاحب کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی کہ انہوں نے اسے ایک ہمہ گیر اور انقلاب آفریں تحریک بنایا اور اس میں اسلام کا عنصر اتنی قوت سے داخل کردیا کہ اسلام اور پاکستان ہم معنی الفاظ نظر آنے لگے۔

''قرار دادِ مقاصد'' پر شبانہ روز کام کرنے کے علاوہ اسلام کی خدمت کا جو بھی موقع ملتا' اُسے ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک دفعہ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے خاصے فنڈ جمع ہوگئے تھے۔ مولوی تمیز الدین خان مرحوم نے تجویز پیش کی کہ اس رقم سے اسمبلی کے لان میں مسجد تعمیر کی جائے۔ مسلم ممالک سے لوگ آتے ہیں اور میں مسجد کے بغیر سخت پریشانی محسوس کرتا ہوں۔ ایک گروپ نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ نشترؒ صاحب تمیز الدین خان کی حمایت میں ڈٹ گئے اور بالآخر اسمبلی کی عمارت میں ایک حسین مسجد تعمیر ہوگئی۔

نشترؒ صاحب کی عملی اسلامی زندگی کا ایک اور واقعہ الطاف حسن قریشی صاحب نے اپنے مضمون میں رقم کیا ہے۔ یہ واقعہ انہیں مسلم لیگ گارڈز کے سالار سردار علی خان نے سنایا تھا۔ سردار صاحب نے بتایا کہ میں نشترؒ صاحب کے ہمراہ 1957ء میں لاہور گیا تھا۔ وہ قائداعظمؒ کی برسی پر تقریر کرنے کے لیے گئے تھے۔ وہ دور انتہائی پرآشوب اور ہنگامہ خیز تھا۔ اس بات کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کوئی شقی القلب نشترؒ صاحب پر حملہ نہ کردے۔ وہ جس کوٹھی میں ٹھہرے اس کی چار دیواری بہت ہی نیچی تھی۔ کوئی رات کے دس بجے کا عمل ہوگا میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نشترؒ صاحب دل کو تھامے ہوئے میرے کمرے میں آئے۔ میں سمجھ گیا کہ دل پر دوبارہ حملہ ہوا ہے۔ انہیں بستر پر لٹایا اور میزبان کو اطلاع دی۔ چند منٹ میں ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے بغور معائنہ کیا۔ دوا دی اور نشترؒ صاحب کو دلاسہ دیا کہ جلد ٹھیک ہوجاؤ گے۔ مجھے جاتے ہوئے کہہ گئے کہ دل کا دورہ شدت کا ہے سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ رات سخت بھاری ہے۔ چھ سات دن مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں اپنے

کمرے میں آ گیا۔ نشترؒ صاحب سو رہے تھے۔ میں ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد اُٹھتا اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ لیتا کہ نشترؒ صاحب کس حالت میں ہیں۔ رات کے اڑھائی بج گئے۔ میں بستر پر لیٹا تو میری آنکھ لگ گئی۔ تین بجے کے قریب ہڑبڑا کر اُٹھا۔ میں اس طرح سو جانے پر سخت پشیمان تھا۔ میں جلد جلد کھڑکی کی طرف لپکا۔ کھڑکی ذرا اونچائی پر تھی۔ پورے کمرے کا نقشہ ایک نظر میں سامنے نہ آتا تھا۔ میری پہلی نظر بستر پر پڑی۔ وہ خالی تھا۔ میرے ہوش وحواس اُڑ گئے۔ یا اللہ! نشترؒ عافیت سے ہوں۔ پہلا خیال یہی آیا کہ بے ہوشی کے عالم میں وہ بستر سے اُٹھے ہوں گے اور خبر نہیں ان پر کیا گزری ہوگی۔ میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے ہمت کر کے کھڑکی میں سے دوبارہ جھانکا اور پورے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ بستر سے ذرا ہٹ کر نشترؒ صاحب تہجد کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا: ''بھلا اس شخص کو کون گزند پہنچا سکتا ہے؟ اس کو کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو خدا کی حفاظت میں ہے''۔

دستور کمیٹی پاکستان مسلم لیگ

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا آخری اجلاس 13 دسمبر 1947ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کا پہلا سالانہ اجلاس بھی کراچی ہی میں چالیس برس پہلے ہوا تھا۔ صبح کے وقت اجلاس گورنر جنرل کی اور شام کے وقت وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر ہوا۔ قائد اعظمؒ صحت کی خرابی کے سبب صرف صبح والے اجلاس میں شریک ہو سکے۔ مجلس عاملہ نے غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو اب دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس ضمن میں قرارداد کونسل کے سامنے پیش کی جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس 14 اور 15 دسمبر 1947ء کو خالق دینا ہال' کراچی میں ہوا۔ یہ اجلاس اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس میں قائد اعظمؒ نے بطور صدر مسلم

لیگ آخری مرتبہ شرکت کی۔ اُن کو ڈاکٹر نے خرابی صحت کی وجہ سے کونسل کے اجلاس میں شرکت سے منع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوئے اور گھنٹہ بھر تقریر کی۔ اُن کی تقریر کا اُردو ترجمہ سردار عبدالرب نشترؒ نے پیش کیا۔

اجلاس میں لیاقت علی خان نے یہ قرارداد پیش کی: ''آل انڈیا مسلم لیگ کا بنیادی مقصد پورا ہو گیا ہے اور ہندوستان دو آزاد اور خودمختار ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کے لیے مسلم لیگ کے دستور، منشور، اغراض و مقاصد، پالیسی اور تنظیمی ڈھانچے میں بعض تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ اب پاکستان اور بھارت کے مسلمان ایک ہی مشترکہ سیاسی تنظیم سے وابستہ نہیں رہ سکتے، اس لیے اس کونسل کا یہ فیصلہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بجائے پاکستان اور بھارت کے لیے مسلم لیگ کی علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہونی چاہئیں:-

پاکستان مسلم لیگ جس کے کنوینر لیاقت علی خان ہوں گے۔

انڈین یونین مسلم لیگ جس کے کنوینر مرزا محمد اسماعیل ہوں گے (جو مدراس مسلم لیگ کے صدر تھے)۔ اسماعیل اور دوسرے حضرات نے تقریریں کیں۔ قرارداد کے حق میں سب سے مؤثر اور مدلل تقریر سردار عبدالرب نشترؒ نے کی۔

کونسل کے کل 450 میں سے 300 ارکان کراچی پہنچے تھے۔ ان میں سے 160 ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے تھے۔ قرارداد کی مخالفت میں صرف پانچ ووٹ ڈالے گئے۔

''پاکستان مسلم لیگ'' قائم ہونے پر اس کا نیا دستور وضع کرنے کی ضرورت سر پر کھڑی تھی۔ یہ ذمہ داری بھی سردار عبدالرب نشترؒ کے کاندھوں پر ڈالی گئی اور انہیں ''دستور کمیٹی'' کا کنوینر مقرر کیا گیا۔

☆ ☆ ☆

پنجاب کی گورنری

پنجاب کے سرکردہ مسلم لیگی لیڈروں کی باہمی آویزش کی وجہ سے یہاں گورنر راج قائم کر دیا گیا تھا لیکن گورنر سر فرانسس مودی پر بھی اعتراضات وارد ہونے لگے تو اُن کی جگہ سردار عبدالرب نشترؒ کو 2 اگست 1949ء کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔ گورنری کا زمانہ اُن کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ پنجاب میں یہ پہلے مسلمان اور پاکستانی گورنر تھے۔ انگریزوں نے گورنری کی ایسی روایات قائم کر رکھی تھیں جن میں دبدبہ، شکوہ، طنطنہ، سخت گیری اور کم آمیزی کے عناصر غالب تھے۔ نشترؒ صاحب کا مزاج ہی دوسرا تھا۔ وہ تو عوام سے کٹ کر زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گورنری کی پہلی تمام روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بالکل نئی روایات قائم کیں۔

وہ شام کو ہر روز گورنر ہاؤس سے باہر سیر کے لیے نکل جاتے تھے۔ چھابڑی والے پہچان کر سلام کرتے تو مسکرا کر جواب دیتے۔ لوگ اُن کو دیکھ کر جمع ہو جاتے اور اُن کے سامنے اپنی شکایات پیش کرنے لگتے۔ سردار عبدالرب نشترؒ اُن کی شکایات بڑے صبر اور غور سے سنتے۔ ممکن ہوتا تو اُسی وقت حکم جاری کر دیتے یا اُن سے کہہ دیتے کہ کل گورنر ہاؤس آجانا اور میرے سیکرٹری سے کہہ دینا کہ رات کو نشترؒ صاحب سے مال روڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔

الطاف حسن قریشی صاحب نے اپنے ایک عزیز دوست کا چشم دید واقعہ تحریر کیا ہے:

''وہ اُن دنوں طبیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک ہم جماعت کے ہمراہ باغِ جناحؒ میں چلے آئے تاکہ امتحان کی تیاری کر سکیں۔ اُن کے ساتھ ایک سات آٹھ سال کا لڑکا بھی تھا۔ یہ تینوں سائیکل پر آئے تھے۔ یہ دونوں مطالعے میں منہمک ہو گئے۔ لڑکے نے سائیکل اُٹھائی

اور چلانے کی مشق کرنے لگا۔ وہ غالباً اُن دنوں سائیکل چلانا سیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے سائیکل گرنے کی آواز سُنی۔ سر اُٹھا کر دیکھا' کچھ فاصلے پر لڑکا سائیکل سمیت گرا ہوا ہے اور ایک اونچے قد کا آدمی اس طرف بڑھ رہا ہے۔ دور سے بھی محسوس ہوتا تھا کہ لڑکا اس آدمی سے ٹکرا کر نیچے گرا ہے۔ یہ دونوں لپکے کہ کہیں لڑکے کی مرمت نہ ہو جائے۔ جب قریب پہنچے تو حیران ہو کر رہ گئے کہ نشترؒ صاحب لڑکے کو اُٹھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ شفقت سے کہتے جاتے تھے: بیٹا! کسی اور سے نہ ٹکرانا' ورنہ پٹائی ہو جائے گی''۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سرِ شام مال روڈ پر نکل آتے۔ راستے میں چراغ حسن حسرت یا مولانا صلاح الدین احمد مل جاتے۔ سرِ راہ شعر و ادب پر گفتگو چل نکلتی۔ لوگ جمع ہو جاتے۔ سیر اور چہل قدمی کے اس میل ملاپ کے علاوہ نشترؒ صاحب نے عوام سے ملنے کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ ہر جمعہ کو اطلاع دیئے بغیر کسی بڑی مسجد میں پہنچ جاتے اور جہاں جگہ ملتی' چپکے سے بیٹھ جاتے۔ مسجد میں نشترؒ صاحب کے اس طرح بے تکلف آنے اور نمازیوں سے گھل مل کر باتیں کرنے سے اسلامی جذبے کا وہ حسین منظر اُبھر آتا تھا کہ جس کو دیکھنے کے لیے برصغیر کے مسلمانوں کی آنکھیں ترس گئی تھیں۔

محمد حنیف شاہد صاحب نے اپنے ایک عزیز دوست کے حوالے سے لکھا ہے: ''سردار نشترؒ نے اپنے زمانہ گورنری میں حضرت شاہ محمد غوثؒ کے عُرس کے موقع پر مقامی تعطیل کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا تھا۔ جب تک وہ گورنر رہے' عرس کے موقع پر مقامی تعطیل بالکل اُسی طرح ہوتی رہی' جس طرح آج کل حضرت داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر ہوا کرتی ہے''۔

گورنری کے زمانے ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بار سرگودھا گئے۔ خدا جانے' کیا جی میں آئی۔ عام راستے سے ہٹ کر ایک گلی میں چلے گئے۔ ایک بڑھیا اپنی جھونپڑی کے آگے کھڑی ہوئی تھی۔ نشترؒ صاحب نے سلام کیا۔ بڑھیا نے صحت اور زندگی کی دعائیں دیں۔ پھر بڑھیا نے اصرار کیا کہ بیٹا کچھ کھاتے جاؤ۔ نشترؒ صاحب ٹوٹی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن

کے فوجی محافظ کے لیے پڑوس سے ایک کرسی منگائی گئی۔ نشترؒ صاحب نے لسی کے دو گلاس پیے اور پھر بڑھیا کو سلام کر کے آگے بڑھ گئے۔

سردار نشترؒ کی وضع داری، شرافت اور شائستگی کی ایک اور مثال۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ لاہور تشریف لے گئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ گورنر اسٹیشن پر استقبال کے لیے خود موجود ہیں۔ وہ مُصر تھے کہ مادرِ ملتؒ گورنر ہاؤس میں قیام کریں۔ مادرِ ملتؒ کے چہرے سے جب انکار کا تاثر ملا تو سردار نشترؒ نے انتہائی اپنائیت اور خلوص سے کہا: ''مادرِ ملتؒ! میں صرف گورنر نہیں، سردار نشترؒ بھی تو ہوں'' اور یوں اُن کے خلوص نے مادرِ ملتؒ کو گورنر ہاؤس میں قیام کرنے پر مجبور کر دیا۔

1951ء میں تحریکِ پاکستان کے صفِ اول کے رہنما اور قائداعظمؒ کے دستِ راست نواب محمد اسماعیل خان میرٹھ سے اپنے بچوں سے ملنے کے لیے پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں قیام کیا تو سردار نشترؒ سرکاری پروٹوکول نظر انداز کر کے خود اپنے عزیز ساتھی کی جائے قیام پر ملاقات کے لیے گئے اور اُن کو گورنر ہاؤس میں مدعو کیا۔ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں سردار نشترؒ اور نواب اسماعیل خان کئی کمیٹیوں کے رُکن، خصوصاً ''مجلسِ عمل'' کے رُکن ہونے کے ناطے رفیقِ کار بھی تھے، ہم خیال دوست بھی۔

سردار نشترؒ کی دیانت اور امانت کا یہ حال تھا کہ اپنے بیٹوں کو سرکاری گاڑی استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ معمولی سائیکل پر سکول اور کالج آتے جاتے تھے۔ فرض شناسی کی مثال کے طور پر یہ واقعات کافی ہیں۔ انتخابات کے بعد وزیرِ اعظم لیاقت علی خان لاہور آئے اور گورنر ہاؤس میں ٹھہرے۔ اُن کے ہمراہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی تھے۔ انتخابات کے موضوع پر گفتگو چل نکلی۔ اُس وقت پنجاب مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے ذمہ دار آدمی بھی موجود تھے۔ انہوں نے لیاقت علی خان صاحب سے کہا: ''سردار نشترؒ نے انتخابات میں ہماری بالکل مدد نہیں کی۔ وہ تو نرے گورنر ہی رہے''۔

نشترؒ صاحب نے کہا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے گورنر بنتے وقت ایک حلف اُٹھایا تھا۔ وہ مجھے بد دیانتی اور جانب داری کی اجازت نہیں دیتا۔''

ایک دفعہ آئی جی پولیس قربان علی خان نے نشترؒ صاحب سے کہا کہ چونکہ آپ اطلاع دیئے بغیر گورنر ہاؤس سے باہر چلے جاتے ہیں' اس لیے پولیس کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ ذرا احتیاط سے کام لیا کیجیے۔۔

سردار نشترؒ نے جواب میں کہا: ''آپ کی جو رپورٹیں مجھ تک پہنچتی ہیں' اُن میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے کوئی تشویش لاحق ہو۔ اگر واقعی کوئی تشویش کی بات ہے اور عوام مجھے پسند نہیں کرتے تو خدا کے لیے مجھے بتا دیجیے تا کہ میں گورنری سے استعفیٰ دے دوں۔ میں زبردستی لوگوں کی گردن پر سوار نہیں رہنا چاہتا۔''

سردار نشترؒ: نائب وزیر اعظم

مسلم لیگی مصنف اور کالم نگار رضوان احمد ایڈووکیٹ نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' بابت 19 فروری 1969ء میں ایک عجیب بات لکھی تھی کہ: 'مارچ 1951ء میں جب گورنر راج پنجاب سے ختم کیا گیا اور عام انتخابات عمل میں آ گئے تو قائدِ ملت لیاقت علی خان کا یہ خیال تھا کہ مرکز میں نائب وزیر اعظم کا نیا عہدہ قائم کیا جائے اور وہ عہدہ سردار عبد الرب نشترؒ کے سپرد کیا جائے لیکن اُن کا یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔

رضوان احمد صاحب کا یہ بیان بہت معنی خیز تھا اور اکثر راقم کے جذبۂ تجسس کو تحقیق پر اُبھارتا تھا لیکن اس کی کوئی قابلِ اعتبار سند نہیں ملتی تھی۔ بالآخر 14 جون 2008ء کو سردار نشترؒ کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر میاں عزیز الحق قریشی صاحب نے ایک انکشاف خیز بیان سے مصدقہ سند بھی محققین کے لیے فراہم کر دی۔ میاں صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک بڑے رہنما میاں ممتاز دولتانہ کے بھانجے اور اُن کے سیاسی جانشین ہونے کے علاوہ ''نظریۂ پاکستان ٹرسٹ'' کے چیف کوآرڈینیٹر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یہ انکشاف کیا:-

نوابزادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان نے لیاقت باغ' راولپنڈی والے 16 اکتوبر 1951ء کے تاریخی جلسے سے چند دن پہلے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ وزیراعلیٰ پنجاب کو کراچی بلایا اور یہ بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ راولپنڈی کے جلسے میں وہ وفاقی کابینہ میں تبدیلی کا اعلان کرنا چاہتے ہیں اور سردار عبدالرب نشترؒ صاحب کو اپنا نائب وزیراعظم اور اپنے بعد مسلم لیگ کی صدارت سونپنا چاہتے ہیں اور وہ اس کا اٹل فیصلہ کر چکے ہیں۔ سردار عبدالرب نشترؒ کو جو اس وقت پنجاب کے گورنر تھے' اس فیصلے کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا اور جناب ممتاز محمد خان دولتانہ نے بھی جناب سردار عبدالرب نشترؒ کے گوش گزار کر دیا تھا۔ میاں دولتانہ صاحب نے وزیراعظم لیاقت علی خان کو بتایا کہ عین 16 اکتوبر کو وہ خود منٹگمری (ساہیول) میں ایک سکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ وزیراعظم نے میاں صاحب کو تلقین کی کہ وہ راولپنڈی کے جلسے میں نہ آئیں بلکہ منٹگمری جائیں کیونکہ یہ نوجوان نسل کی تعلیم کا مسئلہ ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے۔ لہٰذا جناب دولتانہ آج کل کے خوشامدی وزراء کے برعکس جو اگر وزیراعظم کو ذرہ برابر چھینک بھی آجائے تو بھاگ پڑتے ہیں' راولپنڈی نہ جا سکے۔

جب میاں ممتاز دولتانہ لاہور پہنچے تو ان کو وزیراعظم لیاقت علی خان صاحب پر قاتلانہ حملے کی اطلاع ملی' یہ خبر ملتے ہی گورنر ہاؤس پہنچے اور جناب گورنر سے صلاح مشورہ کے لیے اس سانحۂ عظیم پر ایک دوسرے سے صلاح گیر ہوئے اور راولپنڈی روانہ ہونے کا پروگرام بنایا لیکن دفعتاً چوہدری محمد علی جو کہ کیبنٹ سیکرٹری تھے اُن کا کراچی سے فون آیا اور یہ کہا کہ کوئی وزیراعلیٰ اپنے صوبہ کا دارالحکومت نہ چھوڑے بلکہ گورنر حضرات نمازِ جنازہ میں صوبوں کی نمائندگی کریں گے۔ چنانچہ سردار عبدالرب نشترؒ راولپنڈی پہنچ گئے۔ دوسرے دن جب ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس ہوا تو اس میں گورنر سرحد خواجہ شہاب الدین' اُن کے بھائی اور گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین' وفاقی وزیر خان عبدالقیوم خان' سردار بہادر خان اور محمد

مشتاق احمد گورمانی شامل ہوئے۔

عصر کی نماز سے ذرا پہلے اجلاس شروع ہوا۔ سردار عبدالرب نشترؒ نے اپنے اے ڈی سی جناب شاکر اللہ درانی صاحب کو حکم دیا کہ نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے' جائے نماز لائی جائے۔ بقول شاکر اللہ درانی صاحب' انہوں نے عرض کیا کہ جناب اندر بڑا اہم اجلاس شروع ہوگیا ہے۔ نماز کا وقت ابھی کافی ہے لہٰذا آپ اجلاس میں شریک ہوں تو بہتر ہے۔ سردار صاحب نے یہ کہہ کر موخر کر دیا کہ اندر میرا ہی فیصلہ ہونا ہے لہٰذا نماز زیادہ اہم ہے' لہٰذا فوراً ادائیگی نماز کا اہتمام کیا جائے۔

''قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ خواجہ شہاب الدین صاحب گورنر سرحد کی تجویز پر خواجہ ناظم الدین صاحب کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ انہوں نے مجلس کو بتایا کہ چونکہ صوبہ سرحد سے فی الحال جناب عبدالقیوم خان اور سردار بہادر خان صاحب وفاقی کابینہ میں موجود ہیں لہٰذا اگر سردار عبدالرب نشترؒ صاحب کو وزیر اعظم بنا دیا گیا تو ان دو حضرات میں سے ایک کو استعفےٰ دینا پڑے گا جس پر یہ دونوں خان صاحبان چپ ہو گئے۔ ملک غلام محمد اور چوہدری محمد علی بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ سکندر مرزا اس معاملے میں پوری طرح شامل تھے۔ گورمانی صاحب میاں دولتانہ اور سردار نشترؒ کے گہرے مراسم سے بخوبی واقف تھے' اس لیے انہوں نے بھی سردار عبدالرب نشترؒ کی مخالفت میں ووٹ دیا۔''

برسرِ اجلاس میاں عزیز الحق قریشی نے یہ انکشاف کرنے کے بعد اس کے نتائج پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا: ''قدرت کو یہی منظور تھا' لیکن میری ناقص رائے میں اگر سردار عبدالرب نشترؒ صاحبزادہ لیاقت علی خان کی رحلت کے بعد اُن کی جگہ وزیر اعظم منتخب کر لیے جاتے تو مسلم لیگ اب تک جس طرح کئی حصے بخروں میں بٹی ہوئی ہے' وہ ایک متحدہ جماعت رہتی اور ری پبلکن یا کنونشن نہ بنتی اور نہ مشرقی پاکستان میں خواجہ ناظم الدین کے اور مسلم لیگ کے خلاف وہ ردِعمل ہوتا جو سامنے آیا۔ وہاں جگتو فرنٹ نہ بنتا اور مسلم لیگ

کا مشرقی پاکستان آج پاکستان کا حصہ ہوتا۔ یہ حوالہ نواب صدیق علی خان کی کتاب ''بے تیغ سپاہی'' میں بھی ہے۔''

رہ گئی رضوان احمد مرحوم کی یہ بات کہ لیاقت علی خان کا یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا کہ نائب وزیر اعظم کا نیا عہدہ قائم کر کے اُس پر سردار عبدالرب نشترؒ کو فائز کیا جاتا' اس کی مہلت قدرت نے نہ دی اور 16 اکتوبر 1951ء کو سید اکبر کی سازشی گولی نے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کو شہید کر دیا۔ سردار نشترؒ ایک ماہ مزید 24 نومبر تک گورنر رہے۔ پھر خواجہ ناظم الدین نے ملک غلام محمد کو گورنر جنرل بنا کر اور خود کو وزیر اعظم کے عہدے پر لا کر اپنی کابینہ میں سردار عبدالرب نشترؒ کو وزیرِ صنعت مامور کر دیا۔

وزیر صنعت کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کو ایک صنعتی ملک بنانے کے لیے اور بڑی صنعتوں سے لے کر گھریلو صنعتوں تک کے فروغ کے لیے شبانہ روز محنت کی۔ گوجرانوالہ' گجرات' کراچی جیسے بڑے شہروں کے کارخانوں کے معائنے کے علاوہ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی گئے لیکن اس ملک میں جمہوریت پسندوں کے ساتھ ساتھ کچھ آمرِ مطلق بھی ابتدا ہی سے بیدار ہو گئے تھے جن میں ملک غلام محمد اور میجر جنرل سکندر مرزا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

☆ ☆ ☆

وزارت سے برطرفی

16 اپریل 1953ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ خواجہ صاحب کے ساتھ ہی اُن کی کابینہ بھی ازخود برطرف ہوگئی جس میں سردار عبدالرب نشترؒ بھی شامل تھے حالانکہ خواجہ صاحب کو اسمبلی کا اعتماد حاصل تھا اور انہوں نے چند روز قبل ہی اسمبلی سے بجٹ منظور کرایا تھا۔ یہ ایک طرح سے آئینی (غیر فوجی) انقلاب تھا جس کے پاکستان کی تاریخ پر خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دونوں حضرات کے عہدہ سنبھالتے ہی اقتدار اور اختیارات کی کشمکش شروع ہوگئی تھی اور اس وقت تک رسہ کشی جاری رہی جب تک ملک غلام محمد نے خواجہ صاحب کی موٹر کار اور رہائش گاہ سے پاکستانی پرچم اور جھنڈی نہ اُتروالی، ٹیلیفون نہ کٹوادیا اور اُن کو نظر بند نہ کر دیا۔

ملک غلام محمد نے محمد علی بوگرا کو بلا کر، جو اُس وقت امریکہ میں پاکستانی سفیر تھے، وزیراعظم مقرر کر دیا اور نئے وزراء کی فہرست بھی خود بنا کر محمد علی کے ہاتھ میں تھما دی۔ یوں ملک کو بظاہر سیاسی جمود سے نجات حاصل ہوگئی لیکن امریکہ سے سفیر کو بلا کر وزیراعظم بنانے سے تاثر اُبھرا کہ گویا امریکہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ملوث ہے۔ اُس دن سے آج تک امریکہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں برابر ملوث ہو رہا ہے۔

ملک غلام محمد نے سردار عبدالرب نشترؒ کو محمد علی بوگرا کی اس نئی کابینہ میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس باصول شخص نے اس پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

گورنر جنرل کی طرف سے وزیراعظم کی برطرفی کے اقدام پر عوام حیرت زدہ رہ گئے لیکن زیادہ حیرت اُس وقت ہوئی جب پاکستان مسلم لیگ کی اُس پارلیمانی پارٹی نے، جس

کے لیڈر خواجہ ناظم الدین تھے' بغیر کسی پس وپیش کے محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم کی حیثیت سے قبول کر کے اُنہیں کمال خوش دلی سے اپنا لیڈر چُن لیا۔ عوام کو اُس سے بھی زیادہ حیرت ایک سال بعد اُس وقت ہوئی جب ملک غلام محمد نے 24 اکتوبر 1954ء کو پوری کی پوری آئین ساز اسمبلی ہی کو برطرف کر دیا۔

گورنر جنرل ملک غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو برطرف کرنے کے بعد محمد علی بوگرا ہی کو نئی کابینہ بنانے کی دوبارہ دعوت دی۔ اس کابینہ میں بعض نئے وزراء مثلاً جنرل محمد ایوب خان' میجر جنرل سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب شامل تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی آرمی چیف کو کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح سیاست میں فوج کے لیے مداخلت کی راہ ہموار کر دی گئی' جس طرح خواجہ ناظم الدین کی کابینہ برطرف کر کے امریکہ کی پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی راہ ہموار کی گئی تھی۔

محمد علی بوگرا کی اس دوسری کابینہ میں بھی سردار عبدالرب نشترؒ کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُنہیں گورنر جنرل ہاؤس میں گفتگو کے لیے بلایا اور ہر ممکن دلیل' حربے اور دھمکی سے اُنہیں وزارت میں شامل ہونے کے لیے کہا لیکن نشترؒ صاحب نے اس پیشکش کو بھی قبول نہ کیا بلکہ اس ملاقات کا احوال اپنی ''خودنوشت'' میں ان الفاظ میں بیان کیا:-

''غلام محمد نے ہم سے وزارتیں چھین لیں۔ آئین ساز اسمبلی بھی توڑ دی اور ہمارے پاس قوم کی جو بھی امانت تھی' سب آمرانہ انداز میں سلب کر لی۔ سب کچھ لے لیا اور اب صرف میرا ذاتی وقار باقی تھا۔ سو وہ بھی آج پامال ہو گیا۔ میں اُن کے ذاتی الفاظ تو دوبارہ دہرا نہیں سکتا۔ یہی سمجھو کہ غیر شریفانہ الفاظ سے نوازا گیا' لیکن مجھے اُس کا ذرہ برابر صدمہ نہیں' کیونکہ یہ میری ذاتی بے عزتی تھی۔ قوم کی امانت جو اُس نے چھینی ہے' میں اُسے ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ میں ساری زندگی اس کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آئین ساز اسمبلی توڑنے کے خلاف مولوی تمیز الدین خان نے' جو

اُس وقت سپیکر اسمبلی تھے' ایک مقدمہ سندھ ہائیکورٹ میں دائر کر دیا۔ سردار عبدالرب نشترؒ آخری وقت تک پوری مستعدی اور تن دہی کے ساتھ اس مقدمے کی پیروی کرتے رہے۔

جناب نشترؒ نے اپنی زندگی ہی میں دیکھا کہ ملک غلام محمد کے ساتھ وہی سلوک سکندر مرزا نے کیا جو ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کیا تھا۔ ملک غلام محمد اپنے اقتدار کے آخری ایام میں جو بھی گفتگو کرتے یا بقول نشترؒ ''غیر شریفانہ الفاظ'' استعمال کرتے' اُس کے لیے ایک مترجم کی ضرورت پڑنے لگی۔ غلام محمد کا بیرا اُن کی اس غلیظ زبان کو سمجھتا تھا۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے فوراً بعد مشہور مصنف اور صحافی رئیس احمد جعفری مرحوم نے سردار عبدالرب نشترؒ سے اپنی ملاقات کا احوال لکھا تھا: ''جب سردار نشترؒ کی پشاور روانگی کے لیے سامان وغیرہ بندھ گیا تو میں اس واقعے سے مغموم و متاسف اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر تک ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آغازِ سخن کس طرح کروں۔ آخر جی کڑا کر کے بولا: ''کیا آپ نے کراچی کو اپنے وجود سے محروم کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟'' سردار نشترؒ نے قہقہہ لگایا اور کہا: ''فی الحال تو پشاور جا رہا ہوں لیکن کراچی سے جو تعلق ہے' وہ ختم نہیں ہو سکتا۔ واپس آؤں گا اور ممکن ہے دیر تک قیام کروں۔''

''عین اِس موقع پر جب سردار نشترؒ کراچی سے باہر جا رہے تھے تو محمد علی بوگرہ وزارت کے ایک اہم رُکن سردار صاحب کے پاس تشریف لائے اور یہ پیشکش کی: ''خواجہ صاحب کی وزارت تو اب بحال نہیں ہو سکتی۔ اُسے تو قصۂ پارینہ سمجھیے' لیکن آپ کا جہاں تک تعلق ہے' آپ کو کامل اختیار ہے' جہاں کی سفارت چاہے' قبول کر لیجیے۔ امریکہ' برطانیہ' رُوس یا جس ملک کو بھی آپ پسند کریں۔ میں یہ پیام لے کر آیا ہوں اور اس کا خاطر خواہ جواب لے کر جاؤں گا۔'' سردار نشترؒ نے مناسب بے اعتنائی اور سرد مہری سے یہ گفتگو سماعت فرمائی۔ پھر زہر خند کرتے ہوئے کہا: ''شکریہ۔ نہ میں وزارت کا بھوکا ہوں نہ سفارت کا۔ عیش اور تنعم کی زندگی میں نے کبھی بسر نہیں کی۔ لہٰذا ان دونوں چیزوں سے محرومی میرے لیے ذرا بھی

تکلیف دہ نہیں ہوگی۔''

نشترؒ مرحوم کے سابق رفیقِ وزارت یہ مایوس کن جواب سن کر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکے۔ اُن کے جانے کے بعد نشترؒ صاحب کی عالی ظرفی اور خودداری متاثر رہی اور اُنہوں نے یہ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا: ''نہ جانے ہر شخص کو یہ لوگ بکاؤ مال کیوں سمجھتے ہیں۔''

مایوسی اور اضمحلال کے عالم میں سردار نشترؒ کے دل سے غم ناک شعر برآمد ہوئے۔ اُن کے اِس شعر نے زیادہ شہرت پائی۔

بس اتنی سی خطا پر، رہبری چھینی گئی ہم سے
کہ ہم سے قافلے منزل پہ لُوٹائے نہیں جاتے

☆ ☆ ☆

پاکستان مسلم لیگ کی صدارت

وزارت کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد سردار نشترؒ نے اب کے بکھرے ہوئے مخلص کارکنوں کو مجتمع کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور جگہ جگہ جا کر اپنی پُرزور خطابت کے جوہر دکھائے اور اپنے دل کا درد لوگوں کے سینوں میں منتقل کیا۔

مثال کے طور پر اپریل 1953ء میں نواب شاہ گئے تو وہاں ''ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ'' کے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

''خدا کا شکر ہے کہ اب میں وزارت کے جھگڑوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ اب مجھے موقع ملا ہے کہ میں ایک عام شہری کی حیثیت سے لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں دشمن انتشار پھیلا رہا ہے' بیرونی اور اندرونی ہر لحاظ سے دشمن پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے اور باہمی نا اتفاقی سے پاکستان کی ہوا اکھڑ رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہی حالت رہی تو پاکستان سلامت بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ پاکستان کے قائم رہنے سے نہ صرف ساڑھے چھ کروڑ پاکستانی مسلمانوں کی زندگی ہے بلکہ اُن ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کو نہ بھولیے جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے رحم و کرم پر تلواروں کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک کی نظریں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ پاکستان کا تحفظ عالم اسلام کا تحفظ ہے۔ اگر آپ نے اب بھی آنکھیں نہ کھولیں تو دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور وہ پاکستان جس کو بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا ہے' اس سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ شاید آپ بھول گئے ہیں کہ پاکستان حاصل کرنے

کے لیے آٹھ دس لاکھ انسانوں کی جانیں قربان ہوئیں۔ 75 لاکھ خانماں برباد ہوئے اور سب سے زیادہ شرم کی بات تو یہ ہے کہ چالیس پچاس ہزار بہنیں ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم کا شکار ہو گئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی قربانی کسی قوم نے بھی نہیں دی ہے''۔

اسی طرح 4 اکتوبر 1955ء کو لاہور میں ''مہاجر کنونشن'' کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے اس امر پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا کہ پاکستانی عوام کا حکومت پر اور حکومت کا عوام پر کوئی اعتماد نہیں رہا جس کے نتیجے میں قوم میں بددلی اور مایوسی پیدا ہو گئی ہے اور یہ چیز قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے ..... میں اس قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ یہ وہی قوم ہے جس نے مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود سات سال کے قلیل عرصے میں ایک نئی آزاد مملکت قائم کی تھی۔ مہاجرین جدوجہد آزادی کا ہراول تھے۔ میں انہیں مہاجر یا پناہ گزیں نہیں کہتا۔ میرے نزدیک یہ فاتحین پاکستان ہیں۔ پاکستان مستقبل میں اپنی بقاء و استحکام اور دفاع کے لیے اُن کے جذبۂ قربانی وایثار پر بھروسا کر سکتا ہے۔''

مارچ 1956ء میں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کا منصب سردار عبدالرب نشترؒ کے کندھوں پر ڈالا گیا۔ گورنر جنرل سکندر مرزا نے مسلم لیگ کا شیرازہ بکھیر نے اور اُسے ختم کرنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب کی مدد سے مسلم لیگ کے اندر سے ''ری پبلیکن پارٹی'' کا ملغوبہ پیدا کیا تھا۔ سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب دونوں مل کر ایک سازش کے تحت دستوری نظام کو ناکام بنانے پر تُلے ہوئے تھے تاکہ آمریت کے لیے راہ بالکل ہموار ہو جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی کو نئے انتخابات تک توڑ دیا جائے اور اُس وقت تک گورنر راج قائم رہے۔ یہ 1957ء کا واقعہ ہے کہ سردار نشترؒ نے اسمبلی توڑنے کے اقدام کو عدالت میں چیلنج کر دیا۔ یہ مقدمہ سپریم کورٹ تک گیا۔ نشترؒ صاحب نے اس مقدمے کی خود پیروی کی اور بالآخر کامیاب رہے۔ جن دنوں نشترؒ صاحب اس مقدمے کی پیروی کر رہے تھے، وہ اختلاج

قلب میں مبتلا تھے اور کوئی قابل وکیل بہت بڑی رقم لیے بغیر اُسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر بوجھ اپنے کمزور کندھوں پر اُٹھالیا کہ اگر اس وقت بھی میں قوم کے کام نہ آیا تو پھر یہ زندگی کس کام کی۔

سردار عبدالرب نشترؒ نے مسلم لیگ کے تنِ مُردہ میں نئی رُوح ڈالنے اور اُسے عوامی سطح پر منظم کرنے کی زبردست جدوجہد کی۔ مسلم لیگ کو دوبارہ عوام میں مقبول کرنے کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ ملک کا طوفانی دورہ کیا اور ہر جگہ اپنی پُراثر اور پُرزور خطابت سے لوگوں کے دل جیت لیے۔

اس سلسلے میں لاہور آئے۔ موچی گیٹ کے باہر کھلے میدان میں اہلِ لاہور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''بہار اور اڑیسہ کے در و دیوار سے پوچھو یوپی کے سرسبز و شاداب میدانوں سے سوال کرو۔ بنگال اور آسام کی گُل پوش ڈھلوانوں کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرو جنوبی ہند کی سنگلاخ بلندیوں میں ہماری آوازِ بازگشت کا کھوج لگاؤ۔ دُور کیوں جاتے ہو درۂ خیبر سے پوچھو..... اور اگر اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تو لاہور کی شاہی مسجد کے بلند و بالا میناروں سے خدا کی قسم لے کر پوچھو کہ ہم نے پاکستان کا کیا تصور پیش کیا تھا۔ ابھی تک برصغیر کی پوری فضا لا الہ الا اللہ کے نعروں سے گونج رہی ہے''۔

25 جولائی 1956ء کو کراچی کے جہانگیر پارک کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''وہ لوگ جو سازش کر کے آپ کی حکومت پر قابض ہیں، سمجھتے ہیں کہ وہ سارے ملک کے مالک ہیں کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ عوام سوئے ہوئے ہیں۔ یاد رہے میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ اگر صدر بگڑ جائے تو اس کا علاج بہت آسان ہے، اس لیے کہ یہ دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ وزیر کا علاج بھی بہت آسان ہے۔ مگر قوم کے اندر مایوسی پیدا ہو جائے اور وہ لاتعلقی کا اظہار کرے تو اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مجھے ڈر ہے' دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے

وزیروں کے آنے جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگوں کی کوشش ہے کہ قوم کی اسپرٹ ختم کر دی جائے۔ یہ اسپرٹ اور جذبہ قوم کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب پاکستان بنایا گیا تو ہمارے پاس فوج یا امریکہ کی پشت پناہی نہ تھی لیکن دس کروڑ کی قوم نے جو اقلیت میں تھی' اپنی مجاہدانہ اسپرٹ کے ذریعے ہندو اور انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور نعرہ لگایا تھا کہ پاکستان لے کر رہیں گے۔ یہ نعرہ زندہ انسانوں کا نعرہ تھا۔ سات سال کے اندر آپ نے بغیر مادی طاقت کے پاکستان بنایا اور پاکستان بن کر رہا۔ گاندھی اور نہرو کے 30 کروڑ ہندوؤں اور برطانوی طاقت کو ہم نے شکست دی اور دو دولت مند جماعتوں کانگریس اور برطانیہ کا مقابلہ کیا تو پھر وہ جولارڈ ویول اور کننگھم کا بستہ ڈھوتے تھے ان سے کیا ڈر۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں ہماری کمزوریوں کا حال معلوم ہے اور وہ یہ کہ ہم غیر منظم ہیں اور اس لیے ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم میں تنظیم نہ ہونے پائے ورنہ اگر صرف کراچی کے عوام ہی منظم ہو جائیں تو ان کی دھجیاں اُڑا دیں۔ مسلمانانِ پاکستان کو منظم کرنے والی واحد جماعت مسلم لیگ ہے جو شرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور پاکستانی نظریہ کی حکومت قائم کر سکتی ہے۔

اس وقت ملک کے دونوں حصوں میں اس کی شاخیں ہیں کو بعض مرجھا گئی ہیں مگر انہیں سرسبز کیا جا سکتا ہے۔ 1956ء کے آئین کے احترام پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ 23 مارچ کو آئین منظور کیا گیا اور اس کے آٹھ دن بعد جب لوگوں نے مغربی پاکستان کے کانگریسی وزیر اعلیٰ کو ناپسند کیا تو اسمبلی کے ممبران کے ساتھ زبردستی کی گئی۔ ان میں سے کسی کو وزارت کا لالچ دیا گیا تو کسی پر فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ اس دھاندلی سے تنگ آ کر

ایک نے خودکشی کرلی۔ یہ سب گاندھی جی کے چیلے ڈاکٹر خان نے کیا جو اپنے کو انصاف کا دیوتا بتاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ان پر کوئی سیاسی رنگ نہیں تھا بلکہ بھائی کا رنگ تھا ورنہ وہ خودغرضی میں دوسروں کا آلۂ کار نہ بنتے اور ان سے جو کچھ ان کے آقا کرانا چاہتے ہیں نہ کرتے۔ آئین کی منظوری کے آٹھ دن بعد گورنمنٹ ہاؤس میں کہا جاتا ہے کہ ہم مسلم لیگ کو تباہ کردیں گے۔ پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کو ختم کرنے کی قسم کھائی تھی مگر انہیں 1947ء میں مسلم لیگ کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا اور پاکستان دینا پڑا۔

اسی طرح اب دیکھنا ہے کہ کس طرح مسلم لیگ تباہ کی جاتی ہے۔ سابق حکومتوں کی کارگزاریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سردار نشترؒ نے فرمایا کہ زمین تو ہم نے حاصل کرلی مگر مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے پاکستان چند لوگوں کی خاطر حاصل نہیں کیا گیا تھا کہ سرمایہ دار روپیہ جمع کریں۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہمارے غیر منظم رہنے کی وجہ سے وزیر تاش کے پتوں کی طرح ہیں کہ انہیں جدھر چاہیے اُٹھا کر رکھ دیجیے۔ جو لوگ وزارتوں کی خاطر مسلم لیگ چھوڑتے ہیں بہتر ہے کہ وہ جلد جماعت سے باہر چلے جائیں' اس لیے کہ یہ لوگ جو زمین پر بوجھ بنے ہوئے ہیں' وہ کبھی بھی زرعی کاشت پر کسانوں کو حق نہیں دیں گے اور مزدوروں کی جائز مزدوری نہیں دیں گے۔ اس لیے زرعی اصلاح تقریروں اور اخباروں میں مضمون لکھنے سے نہیں بلکہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح منظم بننے سے ہوگی ..... اس لیے میں تمام پُرانے مسلم لیگی حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی اصلی جماعت میں آکر جمہوریت کو زندہ کریں اور اسلامی حکومت قائم کریں''۔

30 اگست 1956ء کو سردار عبدالرب نشترؒ نے پشاور کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

''ہمارے سامنے کشمیر کا مسئلہ یا کسانوں اور مزدوروں کے مسائل ہی نہیں' بلکہ بہت

سے مسائل ہیں، جن کو حل کرنا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس میں کامیاب ہوں گے۔ آپ پاکستان کو ہر لحاظ سے مکمل کر کے رہیں گے۔ اپنے اندر سچی اور صحیح روح پیدا کرنی ہوگی کیونکہ پاکستان کو وہ لوگ مکمل نہیں کر سکتے جو ہمیشہ پاکستان کے نظریے کی مخالفت کرتے رہے ہیں یا جو انگریزوں کے پیچھے فائلیں لے کر چلتے رہے ہیں۔ جنہوں نے انگریزوں کے دفتر میں بیٹھ کر انگریزوں سے تربیت حاصل کی، یا وہ لوگ پاکستان کی خدمت نہیں کر سکتے جو نظریاتی طور پر پاکستان کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتے تھے مگر اس پر ان کا ایمان اور عقیدہ ہی نہ تھا۔ یہ کام صرف مسلم لیگ ہی کر سکتی ہے۔ اس کے لیے آپ کو اور ہمیں مل کر اس ملک میں عملاً صحیح اسلامی حکومت قائم کرنی ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے اور اسی باعث مجھے قدیمی دیوانہ کہا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں شراب پی کر دیوانہ نہیں ہوتا۔ میں سازشوں کا دیوانہ نہیں۔ ہمارے ہاں سازشوں کی مجلس منعقد نہیں ہوتی۔

خرد کی رات فقط سازشوں میں کٹتی ہے
بتوں کی خیر مناؤ، مسجد کی فکر کرو

یہی جنون تھا جس کی بدولت دس کروڑ افراد نے پاکستان حاصل کیا۔ پاکستان کسی تھامس کک کی دکان پر نہیں پڑا ہوا تھا۔ یہ بے پناہ قربانیوں سے بنا ہے۔ تاریخ میں قربانیوں کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ یہ قربانیاں اس لیے نہیں دی گئیں کہ چند افراد سازشوں کے ذریعے حکومت کریں اور پاکستان کو ختم کر دیں"۔ کشمیر کے اہم مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کشمیر قرارداد سے نہیں ملے گا۔ کشمیر جذبہ پیدا کرنے سے ملے گا۔ اپنے اندر جذبہ پیدا کیجیے۔ میں نے اس سے پیشتر بھی کشمیر کے متعلق دو برس پہلے کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ کشمیر حاصل کرنے کے لیے کشمیر نیشنل گارڈز بنائیے۔ یقین کیجیے اس وقت تک پاکستان مکمل نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کی حدود مکمل ہو سکتی ہیں جب تک کشمیر نہیں ملتا۔ اس کے لیے آپ مجاہد بھرتی کیجیے۔

عوام کی اقتصادی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ وہ ملک اسلامی ملک نہیں کہلایا جا سکتا جہاں کے لوگ بھوکے ننگے ہوں مفلس ہوں۔ اسلامی حکومت ان مسائل کو حل کرنے کی ذمہ دار ہے۔ لیکن یہ منزل کب قریب آئے گی؟ جب ہم سب متحد ہو جائیں گے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح ہم ایک لڑی میں پرو دیے جائیں گے۔ جس طرح 1947ء میں اتحاد پیدا ہوا تھا' اسی نوعیت کا اتحاد پیدا ہو تو ہم کامیاب ہوں گے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ ہم خلافتِ راشدہ کا دور واپس لے آئیں گے۔ صدیوں پیشتر کے وقت کی طنابیں کھینچ لائیں گے لیکن ہم وہ نظام ضرور واپس لا سکتے ہیں اور انہیں بنیادوں پر وہ نظام استوار کر سکتے ہیں۔

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بھی اُن کی دیانت و صداقت کے کتنے ہی واقعات مذکور ہیں۔ مثلاً صدر مسلم لیگ کی میز پر دو ٹیلی فون رہتے تھے۔ ایک مسلم لیگ کا اور ایک اُن کا ذاتی۔ وہ مسلم لیگ کے ٹیلیفون پر نہ ذاتی کال کرتے تھے اور نہ ذاتی کال سنتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے بیٹے جمیل نشتر ذاتی کام سے مسلم لیگ کا ٹیلیفون استعمال کرنے لگے تو سردار صاحب نے انہیں روک دیا۔ جمیل صاحب نے کہا: ''یہ لوکل کال ہے۔ اس پر پیسے تو نہیں لگتے۔''

سردار نشترؒ نے جواب دیا: ''لیکن غلط استعمال کی عادت پڑ جاتی ہے''۔

☆☆☆

آخری ایام

1957ء کے اوائل سے سردار عبدالرب نشترؒ اختلاجِ قلب کے باقاعدہ مریض بن گئے تھے۔ دل کے مریض تو وہ پہلے بھی تھے' لیکن مرض شدید مصروفیات کے تلے دبا ہوا تھا۔ جوانی میں وہ تو اناو تندرست اور ہشاش بشاش نظر آیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے قوم کی خاطر اپنی گھریلو زندگی اور اپنے بچوں کی آسودہ حالی کی بھی پروانہیں کی تھی۔ ایک مرتبہ اُن کی گورنری کے زمانے میں اُن کے ایک بیٹے نے کہا:-

''ابا جان! آپ نے تو اپنی تمام زندگی درویشی کے عالم میں گزار دی ہے لیکن آپ نے کبھی ہمارے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے؟''

اس موقع پر سردار صاحب کے اُس بیٹے نے اُس وقت کے بعض برسر اقتدار اکابرین کے بیٹوں کی آسودہ حالی اور پرمنوں کے حصول کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ آپ کی سخت گیری کا یہ عالم ہے کہ آپ ہمیں گورنر ہاؤس کی سٹاف کار بھی استعمال نہیں کرنے دیتے اور ہمیں لاہور کے ایسے سکول (سنٹرل ماڈل) میں داخل کرا دیا ہے جہاں عام شہریوں کے بچے پڑھتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ سردار نشترؒ نے اپنے بیٹے کے شکوے کے جواب میں کہا: ''بیٹا! تم نے مجھ سے آج جو باتیں کی ہیں' اُن کا جواب تمام اہلِ خانہ کی موجودگی میں آج رات کھانے کی میز پر دوں گا۔'' چنانچہ رات کا کھانا چُن دیا گیا تو سردار صاحب نے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے بیٹے کے شکوے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:-

''میں آج ایک بات آپ لوگوں کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری اولاد یا خاندان کا کوئی فرد مجھ سے زندگی کے کسی موڑ پر یہ توقع نہ رکھے کہ میں اپنے اختیارات یا اثر و

رسوخ استعمال کر کے آپ لوگوں کے لیے پرمٹوں' پلاٹوں اور فیکٹریوں کے اجازت نامے دلانے کے لیے گناہ کا ارتکاب کروں گا۔ میری ایک بات غور سے سنو۔ میرے والد محترم نے مجھے وکالت پاس کرانے کے لیے اپنا جدّی مکان فروخت کر دیا تھا اور جب وہ اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوئے تو میرے تعلیمی اخراجات کی کفالت کے باعث مقروض تھے لیکن جب نشترؒ اس عالمِ ناپائیدار کو خیر باد کہے گا تو اپنی اولاد کو مقروض چھوڑ کر نہیں جائے گا۔''

شدید بیماری میں بھی اُن کی شرافتِ نفسی اور اخلاقی قدروں میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔ سردار نشترؒ کے فرزند جمیل نشتر بیان کرتے ہیں:-

''1957ء کے آخر میں اُن پر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے سختی سے ہدایت کی کہ اُن سے کسی کو نہ ملنے دیا جائے۔ ایک دن پاکستان کے وزیراعظم چندریگر اُن سے ملنے آئے۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ وہ کسی ضروری کام سے آئے ہوں گے' ملنے کے لئے اندر بھیج دیا۔ چندریگر جب مل کر واپس چلے گئے تو سردار علی جان آئے جو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے سالار تھے۔ میں نے اُن کو روک دیا۔ اس پر علی جان نے کہا کہ میں ایک منٹ کے لیے سردار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ بس ایک نظر ڈال کر واپس ہو جاؤں گا۔ میں نے اس پر علی جان کو سخت سُست کہا کہ تمہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ تمہارے اس طرح ملنے سے سردار صاحب کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔'' جمیل نشتر کہتے ہیں کہ دو چار منٹ تک ہم دونوں زور زور سے بولتے رہے۔ آخر علی جان واپس جانے لگے۔ اتنے میں والد صاحب نے مجھے پکارا۔ میں اندر گیا تو کہنے لگے: ''جب وزیراعظم آئے تو تم نے انہیں اندر آنے دیا اور جب علی جان آیا تو تم نے اُسے روک لیا کہ وہ ایک غریب آدمی ہے۔ بلاؤ' اُسے بلاؤ۔ میرا سرمایہ یہی مخلص کارکن ہیں۔ میں زندگی بھر چھوٹے بڑے کے درمیان فرق کے خلاف لڑتا رہا۔ کیا تم آخری وقت میں میری کمائی ضائع کرنا چاہتے ہو۔''

تحریکِ پاکستان کے اس عظیم رہنما اور مسلم لیگ کے ہراول کے قائد' سردار عبدالرب

نشترؒ کی معاشی کسمپرسی کا حال خواجہ محمد افتخار مرحوم نے اپنی کتاب ''دس پھول ایک کانٹا'' میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے:-

''سردار عبدالرب نشترؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک وقوم کی خدمت کرنے میں بسر ہوا لیکن وہ جب تک زندہ رہے اپنے دامن کو روپے پیسے اور دھن دولت کی ہوس سے اس حد تک پاک رکھا کہ جب انہیں علالت کے باعث کراچی کے ایک ہسپتال میں داخل کیا گیا تو انہی دنوں ایک روز کیمبل پور کے معروف مذہبی وسیاسی رہنما پیر محی الدین لال بادشاہ المعروف پیر آف مکھڈ سردار صاحب کی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچے تو سردار صاحب کے ذاتی معالج ڈاکٹر پراچہ صاحب کے ساتھ پیر صاحب کا آمنا سامنا ہوگیا۔ پیر صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے سردار صاحب کی علالت کا حال اور خیریت دریافت کی تو ڈاکٹر صاحب نے پیر صاحب کو بتایا کہ سردار صاحب کے لیے جن دوائیوں وغیرہ کی ضرورت ہے وہ کافی مہنگی ہیں اور سردار صاحب کے مالی حالات ایسے ہیں کہ وہ ہسپتال کے کمرے کا کرایہ ادا کرنے اور دوائیاں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ چنانچہ پیر آف مکھڈ جب سردار صاحب کی عیادت کے لیے اُن کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے سردار صاحب کی مزاج پرسی کے کچھ دیر بعد سردار صاحب کی نظر بچا کر اُن کے تکیے کے قریب تین ہزار روپے رکھوا دیے اور سردار صاحب کو صحت وسلامتی اور درازیٔ عمر کی دُعائیں دیتے ہوئے ہسپتال سے رُخصت ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار صاحب نے کروٹ بدلی تو اُنہوں نے جب یہ رقم اپنے سرہانے کے قریب پڑی دیکھی تو اُن کے ایک خدمتگار نے اُنہیں بتا دیا کہ ابھی ابھی جو پیر صاحب آپ کی عیادت کے لیے آئے تھے وہ یہ رقم آپ کی نظر بچا کر آپ کے سرہانے رکھ گئے ہیں۔ چنانچہ سردار صاحب نے اُسی وقت وہ رقم بذریعہ منی آرڈر پیر آف مکھڈ کے پتے پر ارسال کردی اور اسے قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذرت کردی۔''

وفات وتدفین

سردار نشترؒ 14 فروری 1958ء کی صبح حسبِ معمول ساڑھے پانچ بجے بیدار ہوئے اور فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وظائف میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں آپ نے دل کے مقام پر درد محسوس کیا اور اپنی اہلیہ محترمہ کو بلا کر انہیں تکلیف سے آگاہ کیا۔ تقریباً پونے سات بجے یہ درد شدت اختیار کر گیا تو وہ وظیفہ ختم کر کے دوبارہ بستر پر لیٹ گئے۔ سردار صاحب کے بیٹے نے ٹیلیفون پر کرنل سرور، ڈاکٹر کمبالہ اور ڈاکٹر شفیق کو بلایا لیکن ڈاکٹروں کے پہنچنے سے پہلے ہی سردار نشترؒ رحلت کر گئے۔ سب سے پہلے جو اصحاب تعزیت کے لیے مرحوم کی جائے رہائش پر پہنچے، اُن میں مادرِ ملتؒ، وزیر اعظم ملک فیروز خان نون، آئی آئی چندریگر، مسٹر اصفہانی، اسلم خٹک، خان عبد الغفار خان، چودھری خلیق الزماں، عبد الصمد خان اچکزئی، محمد ایوب کھوڑو، شیخ مجیب الرحمان وغیرہم شامل تھے۔ اُن کے انتقال کی خبر فوراً سارے شہر میں پھیل گئی۔ شام تک مرحوم کے مکان پر لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ وہ اپنے محترم قائد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے۔ ہر آنکھ پُرنم تھی اور ہر شخص مرحوم کی قومی خدمات کا اعتراف کر رہا تھا۔

آپ کا جسدِ خاکی رات کے آٹھ بجے قائداعظمؒ کے جوار میں لحد میں اُتارا گیا۔ مرحوم کے جنازے میں اتنے لوگوں نے شرکت کی کہ آج تک کراچی میں کبھی اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوا تھا۔ سردار نشترؒ نے ملک و ملّت کی خدمت کے سلسلے میں بارہا اسی میدان (جہانگیر پارک) میں اور اسی جگہ قوم سے خطاب کیا تھا اور آج اُن کی میت دُنیاوی زندگی کو خیرباد کہہ کر اسی جگہ تدفین کے لیے منتظر تھی۔ نمازِ جنازہ کے وقت یہ عالم تھا کہ جہانگیر پارک کے وسیع میدان میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ جنازہ گاہ تک سارے راستے میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز فوجی انداز سے جلو میں چلتے رہے۔

وزیر اعظم ملک فیروز خان نون سردار صاحب کی میّت کو قائداعظمؒ کے مزار کے

احاطے میں دفن کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ قائداعظمؒ کے مقبرے کے احاطے کے اندر کسی کو بھی دفن نہ کیا جائے ورنہ یہ عام قبرستان بن جائے گا لیکن مسلم لیگ کے اُس وقت کے اکابر اس حق میں تھے کہ سردار نشترؒ کو ضرور بالضرور قائداعظمؒ اور قائدِ ملت کے جوار میں ہونا چاہیئے۔ بالآخر معاملہ مادرِ ملتؒ کے رُوبرو پیش ہوا۔ محترمہ نے سردار نشترؒ کو قائداعظمؒ کے مزار کے احاطے میں دفن کرنے کی وکالت کی۔ چنانچہ سردار عبدالرب نشترؒ جس طرح زندگی میں قائداعظمؒ قائدِ ملت اور مادرِ ملت کے جلو میں رہتے تھے اُسی طرح وفات کے بعد بھی اُن کی قربت نصیب ہوئی۔

سردار نشترؒ کی اچانک رحلت کی خبر سن کر پاکستان کے چپے چپے میں غم واندوہ کا منظر چھا گیا۔ اخبارات اور ریڈیو پر تعزیت ناموں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اخبارات نے سیاہ حاشیے کے ساتھ خبریں شائع کیں' اداریے تحریر کیے۔ ادیبوں نے تعزیتی مضامین لکھے۔ شاعروں نے مرثیے لکھے۔ بزرگ شاعر نثار احمد انور جالندھری نے ارتجالاً اُسی شب یہ غم ناک نظم لکھی۔

کس کی وفات کی یہ خبر مشتہر ہوئی
شمس و قمر کا نور بھی سکتے میں آ گیا

دیوار و در سے' درد کی آنے لگی صدا
رنج و الم کا رنگ زمانے پہ چھا گیا

پژمردہ ہوگئے گل و گلزار سربسر
عالم تمام کرب کے نرغے میں آ گیا

جس کی صفات لکھنے میں ہرگز نہ آ سکیں

وہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کو رُلا گیا

اُس کا وجود تھا غمِ ملّت لیے ہوئے
وہ مر کے بھی حیات کا رستہ دکھا گیا

اب یہ دُعا ہے حق سے وہ جنّت مکین ہوں
جو خوابِ اقتدار سے سب کو جگا گیا

تعجیلِ وقت روک رہی ہے مرا قلم
انور وگرنہ دل تو مرا راہ پا گیا

☆ ☆ ☆

خطباتِ نشترؒ

پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس (مارچ 1948ء)

پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس 26 تا 28 مارچ 1948ء لاہور میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی جس کے افتتاحی اجلاس میں خطبۂ استقبالیہ شیخ عبدالقادر نے پڑھا تھا۔ سردار عبدالرب نشترؒ وزیرِ مواصلات' خاص اس کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی سے تشریف لائے تھے۔ سردار صاحب نے اپنے فی البدیہہ خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا:-

''میں کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کراچی سے حاضر ہوا ہوں تا کہ میں آپ سے صرف یہ عرض کر سکوں کہ آپ کی حکومت کو زبان کے مسئلے سے گہری دلچسپی ہے اور اُسے اس کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے' ورنہ ایسے ایسے ادبا و فضلا کی موجودگی میں تقریر کرنا تو گستاخی کے مترادف ہوگا۔ میرے پاس کچھ ایسا سرمایۂ ادب بھی نہیں جو میں پیش کر سکوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ عرض کرنے پر مجبور ہوں۔

ابھی ابھی قاری صاحب نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت میں آپ کو علم و بیان سے روشناس کرایا۔ خلق الانسان علم البیان۔ تخلیق کے بعد جو انسان پر احسان ہوا' وہ تعلیمِ بیان ہے۔ گویا بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ بیان زبان کے بغیر نہیں۔ لہٰذا انسان کے لیے زبان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اسی سے اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ جو قوم زبان کو ترقی نہیں دیتی' وہ پست رہتی ہے۔ اُردو ہماری زبان ہے اور اس کے بغیر ہمارے لیے کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں۔

آپ نے زبردست قربانیوں سے ایک حکومت اور ایک قوم پیدا کی ہے۔ ایسے موافق ماحول اور سازگار حالت ہی میں قومی زبان کو پنپنے کا موقع ملتا ہے۔ ماضی قریب میں نہ صرف آپ کی حکومت کی شدید مخالفت کی گئی بلکہ مشترکہ اتحاد و ارتباط کی پیدا شدہ نشانی اُردو کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنے کی مسلسل پیہم کوششیں کی گئیں۔

اِس وقت ہمارے کانوں میں پیہم یہ صدائیں گونج رہی ہیں کہ موجودہ دور جمہوریت کا ہے' یعنی اکثریت کے فیصلے پر سب کچھ موقوف ہے۔ لہٰذا پاکستان کی اکثریت جو زبان استعمال کر رہی ہے' اُسی کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیئے۔ اُردو زبان کی اس مخالفت میں بھی پیش پیش وہی مولوی فضل الحق ہیں' جو ایک سال قبل اِس کی حمایت میں بھی پیش پیش تھے۔ جس طرح اجلاسِ لاہور میں ''قراردادِ پاکستان'' کے محرک بھی یہی تھے اور بعد میں پاکستان کی مخالفت میں بھی سرگرم رہے۔ اسی طرح کل تک اُردو کی حمایت میں بھی آگے آگے تھے' مگر اب مخالفت میں بھی نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے' جو حشر اُن کی مخالفتِ پاکستان کا ہوا' وہی حشر اُن کی مخالفتِ اُردو کا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ میں آپ پر واضح کردوں کہ قومی زبان کا فیصلہ محض اس بناء پر نہیں کیا جاتا کہ کونسی زبان اکثریت کی بول چال کی زبان ہے۔ فرانسیسی زبان ساری دُنیا کی ڈپلومیٹک لنگوافرنیکا ہے حالانکہ فرانسیسی دُنیا کی سب سے کثیر التعداد قوم نہیں۔

قومی زبان میں کچھ بنیادی صلاحیتیں اور خصوصیتیں ہونی لازمی ہیں۔ اُردو میں وہ سب خوبیاں اور خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ خاص طور پر لائق التفات بات یہ ہے کہ جہاں جہاں جس حد اور درجے تک اُردو مروّج ہے' وہاں مسلمانوں میں اُسی حد اور درجے تک شائستگی' روشن خیالی اور قومی شعور پایا جاتا ہے۔ جہاں اُردو کا رواج کم ہے یا نہیں ہے' وہاں اُسی حد تک شائستگی' روشن خیالی اور قومی جذبہ مفقود ہے لیکن اس کے برعکس ہندوستان کی تمام صوبجاتی زبانیں اِن صفات کی حامل نہیں۔ مثلاً پنجابی' بنگلہ اور پشتو وغیرہ کو لیجیئے۔ یہ صرف

صوبائی حدود تک ہی محدود ہیں۔ آپ کو فرانسیسی زبان کی بین الاقوامی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُن وجوہ پر غور کرنا چاہیئے جس کے باعث اُس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی۔ پھر آپ پر اصل حقیقت عیاں ہو جائے گی۔ اُردو صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مخالفین خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ شمال مغربی کوہستان سے لے کر خلیج بنگال اور بحرِ ہند کے ساحل تک اس کے سمجھنے والے آپ کو ملیں گے۔

اب جبکہ ہندوستان کا تمام نقشہ ہی بدل چکا ہے انگریزی زبان جو ملک پر آج تک جاری تھی اُس کو بھی بدل جانا چاہیئے۔ اُس کی جگہ لینے کے لیے اُردو کے سوا کوئی اور زبان موزوں نہیں۔ صوبائی زبانیں صوبوں میں تو ذریعہ تعلیم بن سکتی ہیں مگر مرکزی حیثیت اُن کو تفویض نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے بنگالی مسلمان بھائیوں کی ہم سے بیگانگی اور اجنبیت کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اُردو سے بیگانہ اور اجنبی رہے ہیں۔ خود بنگالیوں کے نقطۂ نظر سے بھی اُردو ہی کو تمام پاکستان کی قومی زبان بنانا چاہیئے کیونکہ یہی زبان پاکستان کے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر بیگانگی و اجنبیت کے احساسات کو دُور کرے گی۔

قیامِ پاکستان کے بعد تمام صوبوں کے نمائندوں کے اجتماع میں متفقہ طور سے اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ قوم کی ترقی کے لیے اُردو کو مرکزی حیثیت دے کر اُس کی ترویج کے لیے ہر ممکن سعی عمل میں لائی جائے۔ اب صرف چند فتنہ پرداز حضرات نے اپنی اغراض کے پیش نظر بنگال میں عوام کو گمراہ کرنے کے لیے چولا بدل کر یہ ہنگامہ بپا کیا ہے تاکہ اس طرح آپ کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے حکومت کی مشینری میں رکاوٹ پیدا کی جائے۔ فی الحقیقت اُن کو خود بھی اپنی کوششوں پر یقین نہیں۔ وہ آپ کی تو کیا تمام دُنیا کی آنکھوں میں دُھول ڈالنا چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ پانچ کروڑ کی آبادی میں سے چند کالی بھیڑوں جیسے قلابازانِ فتنہ زا حرکات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے۔ بھولے بھالے عوام کو گمراہ

کرنے والے بہت جلد خود ہی عریاں ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے تا کہ وہ ملک اور قوم کے حق میں زہر ہلال نہ بنیں۔ قائد اعظمؒ نے زبان کے بارے میں غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اپنا یہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ ملک کی زبان اُردو ہوگی۔ ہم اِن مشکلات سے ناواقف نہیں جو ہمارے راستے میں حائل ہوں گی۔ کچھ لوگ ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان دیرپا اور قائم رہنے والا نہیں' مگر یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ یہ پودا ایسا نہیں کہ اس کو بیخ و بُن سے اُکھاڑا جا سکے۔ اتنی زبردست قربانیوں سے سینچے جانے پر اس کی جڑیں تحت الارض یعنی پاتال تک پہنچ چکی ہیں۔

جب ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تو ہم نے یہ اعتراض اُٹھایا تھا کہ انڈیا تو متحدہ ملک کا نام تھا۔ چونکہ ملک کی وہ خودساختہ وحدت برقرار نہیں رہی' اس لیے اس کے صرف ایک حصے کو اسی نام سے موسوم کرنا جائز نہیں۔ اس سے تمام دُنیا کے غلط فہمی اور دھوکے میں مبتلا ہونے کا احتمال ہی نہیں' بلکہ یقین واثق ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ہم کو اس کا یہ جواب ملا کہ جب پاکستان کا نام ہی ہمارے کانوں میں کونجتا ہے تو ہم کو ناگفتنی صدمہ پہنچتا ہے لیکن آپ پھر بھی اس کے لیے بضد ہیں تو آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ ہمیں ہمارے ملک کا نام بدلنے پر مجبور کریں۔ آپ حضرات کو اِس بارے میں ہمیں معذور خیال کرنا چاہیئے۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب (ڈاکٹر عمر حیات ملک) لائقِ صد تحسین ہیں کہ اُنہوں نے اِس فتنے کو بروقت بھانپا۔ آپ اُردو کو پناہ گزیں اور مجروح تو کہہ سکتے ہیں مگر یتیم نہیں کہہ سکتے۔ بابائے اُردو ہم میں موجود ہیں۔ زبان کو ترقی و فروغ دینے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے' وہ آپ کو میسر آ چکی ہیں۔ صرف ہمت' بلند حوصلگی اور عزمِ صمیم کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے ہمت سے کام لیا تو میدان آپ کے ہاتھ رہے گا۔

اُردو کی پناہ گزینی پر غور کرنے سے قبل آپ کو یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ اس دور میں پناہ گزینوں کا معاملہ کتنا اہم ہو گیا ہے۔ کل تک دہلی کی اُردو ٹکسالی تھی۔ قلعۂ معلّٰی کی

زبان ضرب المثل تھی۔ پھر لکھنؤ نے بھی ملجا و ماویٰ ہونے کا دعویٰ کیا مگر زبان کے انقلاب سے وہی اُردو اپنے حامیوں کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ سر تیج بہادر جیسے غم گسار بھی خاموشی کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ اب وہی اُردو زمانے کے تھپیڑے کھاتے، جھڑکیاں سہتے' سب دروازوں پر دستک دینے کے بعد دہلی سے پناہ گزینوں کی حیثیت میں پاکستان میں داخل ہوئی ہے۔

کبھی آپ حضرات نے اِس امر پر بھی غور کیا کہ اُردو کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا؟ اسے در بدر پھرنے پر مجبور کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ اس زبان سے پاکستان میں بسنے والوں کا گہرا رشتہ ہے اور یہی اُن کی قومی زبان بنے گی۔ بہتر ہے کہ اس کو مٹا دیا جائے۔ اسے فروغ حاصل نہ ہونے دیا جائے تا کہ اس کے علمی ذخیرے تباہ و برباد ہو جائیں اور پاکستان کے کام نہ آ سکیں۔ ان کی تہذیب و تمدن کا نام و نشان مٹ جائے لیکن اُن کو یہ یاد نہیں رہا کہ یہ امانت ہماری جان کے ساتھ ہے' اور

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا''

(ماخوذ: ماہنامہ ''آموزش'' شمارہ جون 1948ء)

کُل پاکستان اُردو کانفرنس (اپریل 1951ء)

کُل پاکستان اُردو کانفرنس 13 تا 15 اپریل 1951ء کراچی میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح الحاج خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے فرمایا۔ خان بہادر حافظ محمد حبیب اللہ' صدر مجلس استقبالیہ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اُردو کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشترؒ نے فرمائی۔ اپنے فی البدیہہ خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا:

''حضرات! جب بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی جانب سے مجھے حکم ملا کہ میں اُردو کانفرنس میں شرکت اور اس کی صدارت قبول کروں تو مجھے تعجب ہوا کہ اس اہم منصب کے لیے مجھے یاد فرمایا گیا حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں خالص سپاہی آدمی ہوں

اور اس قسم کی خدمت کے سرانجام دینے کے لیے جس قدر علم و بصیرت کی ضرورت ہے' میں اس سے محروم ہوں۔ ابتدا میں مجھے خیال ہوا کہ ہمارے مولوی صاحب قبلہ کسی وجہ سے گڑبڑا گئے ہیں۔ مگر پھر جب میں نے اُن کی اس محبت کا خیال کیا جو ممدوح کو اُردو سے ہے تو میری سمجھ میں آ گیا کہ غالباً ایک بزرگ جو موتمر اسلامی کے حالیہ اجلاس کے زمانے میں یہاں تشریف لائے تھے اور غالباً کچھ باتیں ارشاد فرما گئے جس سے لوگوں میں گمراہی عقل اور فکری ژولیدگی کے آثار ظاہر ہوئے' اس لیے مولوی صاحب نے ضرورت محسوس فرمائی کہ بڑے پیمانے پر ایک کانفرنس طلب کی جائے اور اس معاملہ کو صاف کر دیا جائے۔ میں نے مولوی صاحب محترم کی خدمت میں معذرت پیش کی۔ کچھ وجوہ اپنے عریضے میں تحریر کر دیں کچھ نہ لکھیں۔ لیکن ان کا اصرار تھا۔ بالآخر میں نے سمجھا کہ ایک شخص جو اپنی زندگی کا مقصد و منتہا یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے لیے زندگی وقف کر دینا چاہیئے' وہ ایسی صورت میں جبکہ پاکستان کی عزیز ترین شے پر حملہ ہو رہا ہو' اگر اگلی صف میں حاضر نہ ہوا تو اپنے فرض میں کوتاہی کرے گا۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

حضرات! مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی' جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے ساڑھے تین سال بعد اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ اُردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا جائے۔ درآں حالے کہ واقعہ یہ ہے کہ ہر چند رسمی طور پر مجلس دستور ساز میں یہ فیصلہ نہ ہوا ہو کہ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے مگر واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اُردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان بنے۔ جو لوگ تحریکِ پاکستان سے واقفیت رکھتے ہیں' انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جن باتوں نے برعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کے مطالبے پر آمادہ کیا' ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ 1937ء میں جب صوبائی خودمختاری کے تحت اس برعظیم کی ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے مٹا ڈالنے کے منصوبے بنائے

گئے اور اس غرض کے لیے اُردو کو مختص کیا گیا تو مسلمان چلّا اُٹھے اور برداشت نہ کر سکے۔ جن چیزوں نے یہ احساس پیدا کیا' یہ جذبہ پیدا کیا' یہ ذوق وشوق پیدا کیا کہ اپنا علیحدہ وطن بنائیں تو ان میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ اُردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کریں۔ اُردو ہندی کا جھگڑا تقسیم سے پہلے بھی اُٹھایا گیا تھا۔ مسلمان تو عام طور سے سب ہی اور ہندوؤں کا بھی ایک کثیر حصہ کوشاں تھا کہ ملک کی زبان اُردو قرار دی جائے مگر بعض متعصب ہندو اس خیال سے اُردو کی مخالفت کرتے رہے کہ وہ زبان جس کا ہر لفظ اسلامی تاریخ وعقائد میں رچا ہوا ہے اور جس کے بولنے ہی سے اکثر وہ الفاظ منہ پر آتے ہیں جو مسلمانوں کے عقائد سے مخصوص ہیں' ہندو کی نفسیات پر برا اثر ڈالے گی۔ مجھے یاد ہے کہ یوپی کے ایک وزیر نے جو اُس زمانے میں وزیر تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے اور شاید اب بھی ہوں' اُردو کی مخالفت میں صرف اس وجہ سے بیان دیا تھا کہ اُن کی لڑکی نے ایک موقع پر اُن کے سامنے خدا کا نام لیا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ ''خدا'' کی طرح بہت سے ایسے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں' آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اُردو زبان کے ذریعے ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہو گئے اور اس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ ٹنڈن صاحب اسی لیے اس کی مخالفت فرماتے ہیں کہ یہ اُردو اس دور میں پیدا ہوئی جب کہ ہندو مسلمانوں کے غلام تھے۔ اب سنا ہے کہ کراچی میں کوئی صاحب کہہ گئے ہیں کہ اُردو غلامی کے زمانے کی یادگار ہے۔ اب پتا نہیں ٹنڈن صاحب صحیح کہتے ہیں یا وہ سچ فرماتے ہیں۔ بقول شخصے' فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

تو حضرات میں عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان میں اُردو کی مخالفت اس لیے کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی ثقافت اور تہذیب کی یادگار اور اسلامی روایات کی حامل ہے۔ پاکستان مسلمانوں کا وطن ہے اور یہ ان کے لیے بنا ہے۔ اگرچہ قومی نقطۂ نظر سے ہندو بھی پاکستانی کہلانے کے مستحق ہیں۔ ہم ان کے حقوق تسلیم کرتے ہیں لیکن پاکستان میں مسلمانوں کی

اکثریت ہے۔ تقسیم سے پہلے ہندوستانی مسلمان اور ہندو اکثریت کا مطالبہ تھا کہ اُردو راس کماری سے پشاور تک سارے ہندوستان کی زبان ہونی چاہیئے۔ آج حیرت کی بات ہے کہ اسی ملک کے کسی گوشے سے یہ آواز اُٹھے کہ اُردو کی بجائے کوئی اور زبان ہو...... یہ آواز کم سے کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ انتشار جن افراد نے پھیلانے کی کوشش کی ہے' ان کے آلۂ کار دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو وہ سادہ لوح جو نادانستہ ان کے فریب میں آ گئے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے پاکستان کی وحدت پر حملہ کر کے اس کے قومی و ملی اتحاد کو مٹانے کی غرض سے یہ ناعاقبت اندیشانہ سوال اُٹھایا ہے۔ ایک مقتدر صوبے کے چند ناعاقبت نوجوان دشمنانِ قوم کے جھانسے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ بنگالی چونکہ اکثریت کی زبان ہے' اس لیے اسے تمام پاکستان کی زبان قرار دیا جائے۔ اُس وقت حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے۔ اُنہوں نے محسوس فرمایا کہ یہ تحریک ملک کی وحدت اور بنیادی تخیل پر ایک کاری ضرب ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بہت بڑا خطرہ مول لے کر بنگال پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نیا نیا عالمِ وجود میں آیا تھا اور حکومت بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا طیارہ موجود نہ تھا جو ایک ہی اُڑان میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچ جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس نازک زمانے میں جبکہ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا' قائداعظمؒ ہی کا ناقابلِ شکست اور محکم عزم ہمارا اثاثہ تھا جسے ہم کسی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتے تھے مگر قائداعظمؒ نے ایک پرانی مشین میں مزید پٹرول کا انتظام کیا اور ڈھاکے کے سفر کا خطرہ مول لیا۔ ہماری خواہشات اور درخواستوں کی پروا نہ کر کے اُنہوں نے اپنی زندگی کو لسانی وحدت و استحکام کی بازی پر لگا دیا۔ ایک پرانے ڈیکوٹہ جہاز میں ڈھاکہ پہنچے اور ان سرپھرے طلبہ کو جنہوں نے دشمنانِ پاکستان کے کہنے میں آ کر اس قسم کا سوال اُٹھایا تھا' سمجھایا کہ اگر تم پاکستان کو قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو سکتی ہے' کوئی

دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔ اب اسی سے آپ اندازہ لگائیے کہ زبان کے سوال کو قائداعظمؒ کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اس زمانے میں یہ عام دستور سا ہوگیا ہے کہ ہمارے ملک کے سیاست دان ہر معاملے میں قائداعظمؒ کی سند اپنے اعمال و افعال کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ اپنی تائید میں ان کے بیانات اور سابقہ تحریروں کے حوالے دیتے ہیں مگر یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جن کی رہنمائی میں ملک حاصل ہو' جن کی برکت سے ابتدائی خطرناک سال سکون و امن کے ساتھ گزر گیا (حالانکہ ہر لمحہ اس نوزائیدہ مملکت کے لیے نئے نئے خطرات کا پیغام لاتا تھا) اُنہوں نے اس معاملہ میں مختتم اور فیصلہ کن بات کہہ دی ہے۔ قائداعظمؒ کی اپنی زبان اُردو نہیں تھی مگر اُنہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا اور بار بار کہا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔ اس لیے کسی ایسے پاکستانی کو جو ملک سے محبت اور عقیدت رکھتا ہو اور قائداعظمؒ کو اپنا قائد اور رہنما مانتا ہو' اس کے لیے ہرگز ان کے قول کی مخالفت زیبا نہیں ہے۔ میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ جو چیزیں پاکستان کے قیام اور اس کی عمارت کی سنگ ہائے بنیاد تصور کی جاتی ہیں' ان میں سے اُردو ایک ہے۔ اس کو ہلانا اور مٹانا پاکستان کی بنیادوں کو ہلانا اور مٹانا ہے۔

جغرافیائی نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں بارہ سو میل سے زیادہ کا فرق ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا باہمی اتحاد و اتفاق اور ہماری قومی وحدت اس امر پر منحصر ہے کہ ملک میں فکری و لسانی وحدت ہو۔ اگر ہمارے یہاں مذہب کا اشتراک' زبان کا اشتراک اور فکر کا اشتراک قائم رہے تو ملک کی وحدت قائم رہے گی۔ یہ تین چار باتیں جو اتفاق و اتحاد بلکہ ہماری حیات کی ضامن ہیں' ان میں سے کوئی مٹ جاتی ہے تو ہماری قومیت کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے میں ہر بہی خواہ پاکستانی سے التجا کروں گا کہ معاملہ کو سطحی نظر سے نہ دیکھے اور سوچے کہ کیا اُردو کی مخالفت کسی سچے پاکستانی کے لیے جائز ہے؟ ہمارے یہاں کسی اور صوبے میں تو صوبائی زبان کا سوال نہیں اُٹھا مگر مشرقی بنگال والے بعض بھائی سوال

اُٹھاتے ہیں کہ بنگالی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ شاید اُردو کے قومی زبان بننے سے بنگالی کو نقصان پہنچے گا۔ پتا نہیں اس خطرہ کا احساس کیوں ہوا؟ کہتے ہیں کہ بنگالی بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس میں بہت پُرمعنی ادب موجود ہے۔ اس کے لیے بہت سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں مگر جہاں تک صوبے کے اندرونی معاملات کا اور ابتدائی درجوں میں تقسیم کا تعلق ہے' مقامی زبانوں میں تعلیم دینے کے حق سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ صوبائی زبانوں کا اپنا مقام ہے۔ اگر انہیں اس مقام پر رکھا جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا اور صوبائی زبانیں ترقی کریں گی۔ ان کے لیے خطرہ کا کوئی سوال نہیں مگر جب کسی زبان کو اپنے احاطے سے آگے بڑھاتے ہیں تو مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد۔ جوتے کا مقام پاؤں ہے۔ اگر اسے سر پر رکھا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ اسی طرح ٹوپی کو اگر پیروں میں ڈال دیا جائے تو یہ ایک بدنمابات ہوگی۔ ظلم کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ کسی شے کو اس طرح استعمال کریں جو اس کے لیے ناموزوں ہو۔

صوبائی زبانوں کو خواہ پشتو ہو جو میری زبان ہے خواہ پنجابی' سندھی یا بلوچی' ان سب کے اپنے مقام ہیں۔ اگر یہ سب وہیں رہیں تو ترقی کریں گی۔ اگر انہیں ان کی جگہ سے آگے بڑھایا گیا تو یہ ان زبانوں پر ظلم ہوگا۔

اُردو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی صوبے کی زبان نہیں۔ اس کے باوجود پشاور سے لے کر سلہٹ تک آپ اس میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زبان اظہارِ خیال کا انسانی ذریعہ ہے مگر اپنی بات دوسروں تک اسی وقت پہنچائی جا سکتی ہے جب کہ آپ اپنا مفہوم ایسے الفاظ و اصطلاحات میں ادا کریں جو مخاطب کی سمجھ میں آسکیں۔ کیا اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کے متعلق کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے صوبے کے باہر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے کوئی غور کرے گا تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ پاکستان میں صرف اُردو کو قومی زبان کے مرتبہ پر فائز ہونے کا حق حاصل ہے۔

کچھ دن سے ایک اور سوال عربی کا اُٹھا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اُردو کے بجائے عربی ہونی چاہیے۔ ہمارے بعض بھائی جو خود کو اُردو کا پرستار کہتے ہیں' افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر جواباً ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو عربی کے تقدس اور شان کے خلاف ہیں۔ اُردو کا عربی سے مقابلہ کرنے کا سوال قطعی غیر متعلق ہے۔ عربی کا اپنا مقام ہے اور اُردو کا اپنا۔ ہمیں اس جھمیلے میں پھنسنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو عربی سے بہتر ہے۔ اُردو سے محبت مجھے بھی ہے (میں نے یہاں پرستار کا لفظ دانستہ استعمال نہیں کیا کیونکہ مسلمان سوائے خدا کے کسی کا پرستار نہیں) عربی سے بھی عقیدت ہے۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جو حضرات عربی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کے مدعی ہیں' ان میں سے بمشکل ہی ایک آدھ صاحب عربی لکھ یا بول سکتے ہوں گے۔ اگر ان حضرات نے سنجیدگی کے ساتھ کبھی عربی بولنے اور لکھنے کی کوشش کی ہوتی تو اس کی عملی مشکلات کا اندازہ ہوتا۔ اُردو اور عربی دو الگ الگ زبانیں ہیں اور دونوں میں بعض خوبیاں ہیں۔ عربی قرآن کی' ہمارے پیارے رسول ﷺ کی اور دنیا کے چھ سات کروڑ مسلمانوں کے لیے قابلِ عزت ہے' اس لیے ہر مسلمان کو عربی سیکھنا یا پڑھنا اپنے اوپر لازم قرار دینا چاہیے۔ اس کے ذریعہ ہم اپنے دین کے اصل سرچشمے تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور میری رائے میں ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے لیکن اس کے یہ معنی کیونکر ہوئے کہ چونکہ عربی میں قرآن و احادیث موجود ہیں' اس لیے اُردو خارج البلد کر دی جائے۔ رنگ' نسل اور زبان کا اختلاف تو فطری ہے۔ سورج' چاند' ستارے' زمین' آسمان' دن' رات' رنگ اور زبانیں تو اللہ کی آیات میں سے چند نشانیاں ہیں۔ ان کا وجود ضروری ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ چونکہ قرآن عربی میں ہے اور ہم قرآن پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں اپنی زبان ترک کر دینی چاہیے۔ اگر مسلمان ہونے کی شرائط میں عربی پڑھنے کی شرط بھی شامل ہوتی تو منجملہ اور احکام کے قرآن میں یہ حکم بھی ہوتا کہ اپنی زبانیں چھوڑ دو اور عربی پڑھو۔ اب یہ

عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اپنی زبانیں ترک کرنے کا حکم نہیں دیا' اب بعض حضرات یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اُردو چھوڑ کر عربی اختیار کریں۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان اسلامی اساس پر بنا ہے۔ آپ ضرور اس کی تبلیغ کیجئے کہ عربی کی تعلیم عام ہو مگر اس معاملہ میں غلط مبحث نہ کرنا چاہیے۔ اگر کسی شخص کو بخار ہے تو بخار کا ہی علاج ہونا چاہیے۔ بخار کے علاج کے سلسلہ میں آنکھ کی بینائی کے مخمصے میں نہ پڑنا چاہیے۔ ہمارے سامنے مسئلہ بالکل صاف اور واضح ہے اور وہ یہ کہ اُردو سب جگہ سمجھی جاتی ہے اور اس وقت انگریزی دفتروں پر مسلّط ہے۔ سیاسی طور پر ہم آزاد ہو گئے ہیں مگر ذہنی طور پر ہم اپنے آپ کو اُس وقت تک آزاد نہیں سمجھ سکتے جب تک ہمارے دفاتر پر انگریزی کا تفوق قائم ہے۔ اب ہمیں وہ نسخہ معلوم کرنا ہے جس کے استعمال سے ہمیں صحت حاصل ہو سکے۔ اگر کوئی عربی کا نسخہ بتائے تو میں کہوں گا: تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ ہمیں تو عملی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی تریاق اُردو ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ابھی خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا گیا ہے کہ پاکستان میں ایسے افراد کی تعداد چند سو سے زائد نہ ہوگی جو عربی بول سکتے ہیں۔ جب زبان کے معاملہ میں عربی کی بات چھیڑی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم صدیوں تک انگریزی سے نجات حاصل نہ کر سکیں ..... اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دفاتر کی زبان ایک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی ہے جو یہاں نہ بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے۔ جس کے بولنے والے سات ہزار میل دور ہیں اور ایک قومی حادثہ تھا جس کے تحت وہ یہاں آئے اور کچھ عرصہ رہ کر چلے گئے۔ اب اس زبان کے تسلط سے نکلنے کا علاج کیا ہے۔ میری رائے میں اُردو کے علاوہ کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو پاکستان میں انگریزی کی جگہ لے سکے۔ ابھی میرے ایک بھائی نے چند شعر پڑھے کہ میں نے پنجاب سے انگریزی کا بستر اگول کرا دیا ..... میں انگریزی کا مخالف نہیں ہوں۔ وہ بڑی زبان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان علوم سے جو اس میں ہیں فائدہ اُٹھا کر اپنی زبان کو مالا مال

کریں ۔اُردو میں ابھی بہت سے علوم کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ یہ زبان ابھی بہت کچھ ترقی کرے گی ۔اس سلسلے میں حکومتِ حیدرآباد اور انجمن ترقیٔ اُردو نے بہت خدمت کی ہے مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علوم کی جتنی کثیر اور وافر مقدار انگریزی میں ہے ابھی اُردو میں منتقل نہیں ہو سکی ہے۔ جن لوگوں کو علوم سے شغف ہے' وہ انگریزی بھی پڑھیں گے۔ ہمارے طلبہ جس ملک میں جائیں گے' وہاں کی زبان سیکھ کر وہاں کے علوم سیکھیں گے مگر میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ کوئی زبان وہ مقام حاصل کرے جو اس کا حق نہیں ہے۔ میں عملی آدمی ہوں' اس لیے عملی مشکلات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا' مگر اس معاملے میں بعض لوگ خواہ مخواہ وہم میں مبتلا ہو گئے کہ اُردو سے کام چلنا مشکل ہے۔ جب تک ہم پانی میں قدم نہیں رکھیں گے تیراک کیسے بنیں گے۔ میں نے گزشتہ ڈیڑھ سال میں پنجاب میں اس کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اگرچہ میں بہت مصروف تھا اور وقت میرے پاس بہت کم تھا مگر میں چاہتا تھا کہ صوبہ کا میزانیہ اُردو میں پیش کروں ۔چنانچہ دو ڈھائی گھنٹے مجھے ملے اور جب میں نے بجٹ اُردو میں لکھنے کی کوشش کی تو میرا دل اور حوصلہ بہت بڑھا۔ میں نے سوچا کہ جب مجھ جیسا شخص جو اُردو میں برائے نام شُدبُد رکھتا ہو' اگر وہ اُردو میں بجٹ لکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ذرا سے حوصلے کو کام میں لا کر اُردو کو پاکستان کی دفتری زبان نہ بنا سکیں ۔ میں کہتا ہوں کہ ہم کو قدم اُٹھانا پڑے گا اور اس میں کچھ خطرات ہیں تو انہیں بھی مول لینا ہوگا۔ اگر کوئی لفظ نہ ہو تو عربی' فارسی یا دوسری زبانوں سے لے سکتے ہیں ۔اُردو کا دامن بہت وسیع ہے اور وہ ہر خوبصورت شے کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے ۔اس گلدستہ میں ہر زبان کے الفاظ خوبی کے ساتھ سجائے گئے ہیں ۔جس زبان میں اس درجہ لچک اور صلاحیت ہے اس میں دیگر زبانوں کے عام فہم اور رواں الفاظ نکالنے کی ہمیں ضد نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش رائیگاں ثابت ہوگی ۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے اور ہمیں اصلی معاملات کی طرف توجہ کرنی چاہیئے ۔ بجٹ ہی کا معاملہ لیجیے ۔کچھ لفظ آئے جن کا

ترجمہ میں آسانی کے ساتھ کرسکتا تھا۔ میں نے مڈل اسکول کو وسطانی مدرسہ اور پرائمری کی جگہ ابتدائی یا گرانٹ کو زرِ اعانت نہیں لکھا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ کہیں مجھے گرانٹ کا ترجمہ معلوم نہیں۔ مگر میری غرض یہ ظاہر کرنا تھی کہ جو الفاظ عام ہو گئے ہیں ان کے ٹھکرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ میرا مشورہ ہے۔ میں ماہر لسانیات نہیں ہوں کہ میرا مشورہ ضرور ہی مانا جائے۔ زبان کے معاملے میں تو ماہرین ہی کا قول مستند ہوسکتا ہے اور ہوگا۔ مگر عملی نقطۂ نظر سے میرا خیال ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ جب آہستہ آہستہ اُردو کو اس کا مقام مل جائے تو آپ زبان کی صفائی کی طرف مزید توجہ دے سکتے ہیں۔

اُردو ہماری پُر مایہ اور بڑی صلاحیتوں کی زبان ہے۔ اُردو کے طرفداروں سے میری عرض ہے کہ اشتعال میں آکر اُردو اور عربی کو ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی کی آڑ میں اسلامیانِ پاکستان میں باہمی نفاق کا بیج بو دیا جائے۔ اُردو کا دامن عربی سے معمور ہے۔ حال ہی میں کچھ ماہرینِ تعلیم لاہور آئے تھے تو میں نے اُن سے بھی یہی کہا تھا کہ اُردو کے بہی خواہ کو عربی فارسی سیکھنی چاہیئے۔ اس سے آپ اُردو کو مزید وسعت دیں گے۔ اُردو عربی اور فارسی میں باہمی تناقص اور لڑائی نہیں ہے۔ ایک زبان کو دوسری کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اس بات کے خلاف ہوں کہ عربی پر اُردو کا تفوق ظاہر کرنے کے لیے اخبارات یا رسائل میں کچھ لکھا جائے۔ ایسے لوگوں سے میں کہوں گا کہ اُردو کو چاہنے والوں کو کیوں بے لطف کرتے ہو۔ خدارا بت کو خدا نہ بناؤ' کوشش کرو کہ قومی زبان عام ہو' پھیلے' وسیع ہو' ترقی کرے۔ اس میں علوم کے ترجمے ہوں۔ یہ تعلیم و امتحان کا ذریعہ بنے مگر اسے اشتعال میں آکر اسلامی زبان کے مقابلے میں نہ لانا چاہیئے۔

اب میں چند باتیں ان لوگوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں جو اُردو کی ترقی چاہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کو اندیشہ ہے کہ اُردو کے بجائے کوئی اور زبان قومی زبان بنا دی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ نہ یہ ہوسکتا ہے اور نہ یہ کسی کی مجال کہ اُردو کے سوا کسی دوسری

زبان کو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان بنا سکے۔ اس معاملہ میں تو دل میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں لانا چاہیئے۔ سمجھدار طبقہ جانتا ہے کہ اُردو ہماری قومی زبان ہے اور رہے گی۔ سوال صرف یہ ہے کہ حکومت کے دفاتر میں (یہ دفاتر مرکز کے ہوں یا صوبوں کے) اُردو کو وہ ساری سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور اس پر محبانِ اُردو کو اصرار ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا بھی فرض ہے کہ مشکلات پر نظر ڈالیں اور انہیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً اُردو میں ابھی شارٹ ہینڈ کی دقت ہے۔ مختصر نویسی اس دور میں دفتری کاروبار کے لوازم میں سے ہے۔ ہمارے یہاں مختصر نویسی سیکھنے کی طرف کوئی مائل نہیں ہوتا۔ غالباً اس کی وجہ کسی حد تک یہ بھی ہے کہ انگریزی مختصر نویس کے مقابلے میں اُردو مختصر نویس کو کم تنخواہ ملتی تھی۔ میں نے اپنے صوبے میں دونوں کی تنخواہ برابر کردی ہے تا کہ لوگوں کو مختصر نویسی سیکھنے کی رغبت ہو اور ایسے افراد کی کثرت ہوتا کہ عہدہ داروں کو نوٹ لکھوانے کی سہولت ہو۔ بہت سے عہدہ داروں کا جی چاہتا ہے کہ وہ اُردو میں دفتری کارروائی سرانجام دیں۔ یہ دقت مجھے بھی پیش آتی ہے اور بعض دفعہ انگریزی میں لکھوانا پڑتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہمارے نوجوان اس طرف توجہ کریں گے۔

اسی طرح اُردو ٹائپ کا رواج بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دفتروں میں اُردو کا پھیلنا ناممکن ہے۔ اگر مدرسوں میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتے ہیں تو حکومت اور نجی اداروں کو اُردو میں اصطلاحات کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کرانا چاہئیں۔ پنجاب میں دو ادارے اس ضمن میں قائم کیے گئے ہیں۔ ایک تو سرکاری زبان کی کمیٹی ہے جس کا کام یہ ہے کہ اصطلاحات کے اُردو تراجم مختلف دفاتر میں بھیجے کیونکہ ہر شخص نہ ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ کرسکتا ہے۔ دوسرے اگر مختلف دفاتر میں الگ الگ تراجم ہوئے تو اس سے اصطلاحاتی انتشار پھیل جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جو اصطلاحات معیاری اور مستند ہوں، انہیں ہر جگہ استعمال کیا جائے تا کہ یکسانی پیدا ہو۔ میری رائے میں یہ چیز کل

پاکستان بنیاد پر ہونی چاہیئے ۔ پنجاب کا دوسرا ادارہ ''ترجمہ بورڈ'' ہے جو علمی کتابوں کے تراجم کے لیے بنایا گیا ہے ۔میرا خیال ہے یہ کام سب صوبوں اور مرکز میں ہونا چاہیئے اور یہ کام اتحادِ عمل و باہمی تعاون کے ساتھ کیا جائے تا کہ مطلوبہ مرکزیت حاصل ہو سکے ۔ اس سلسلے میں تعمیری کام کی سخت ضرورت ہے اور اس کے لیے جلسے جلوس اور تقریریں ناکافی ہیں ۔ضرورت اس امر کی ہے کہ زبان کا ذخیرہ بڑھے' اس میں اعلیٰ پائے کی کتابیں موجود ہوں ۔ مصنفین کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تا کہ تحریر و طباعت میں آسانی ہو ۔مختصر نویسی ٹائپ چھپائی وغیرہ کے انتظامات ہونے چاہئیں اور یہ کام جلسوں جلوسوں کا نہیں' یہ تعمیری کام ہے ۔ اول تو حکومت کا ہے' اس کے بعد انجمن ترقیٔ اُردو اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کا فرض ہے کہ وہ مشورے بھی دیں اور عملی قدم بھی اُٹھائیں ۔

حضرات! میں نے آپ کا کافی وقت لیا اور چند باتیں عرض کیں ۔ میں نے جو کچھ کہا' وہ بہ سبیل تذکرہ ہے ورنہ کانفرنس کی خاص چیز تو وہ تجاویز ہوں گی جو یہاں منظور کی جائیں گی ۔میرا عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں اپنا ذہن صاف رکھنا چاہیئے ۔ ہمارا راستہ صاف ہے اور کسی سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ۔کوئی چاہے یا نہ چاہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو یہاں کی زبان ہے اور رہے گی ۔عملاً تو اب بھی یہ ہماری قومی زبان ہے مگر مجھے یقین ہے کہ رسمی حیثیت بھی اسے جلد ہی حاصل ہو جائے گی ۔

آخر میں مجھے ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ یاد دلانا ہے کہ ہمیں اُردو کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے جو اس کے شایانِ شان ہو ۔''

(ماخوذ: ''قومی زبان'' شمارہ: یکم مئی 1951ء)

قائداعظمؒ کی پہلی برسی

قائداعظمؒ کی پہلی برسی 11 ستمبر 1949ء کو منائی گئی ۔ اس اندوہ ناک موقع پر ایک عوامی تقریب یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں سرکاری طور پر منعقد کی گئی ۔ سردار عبدالرب نشترؒ نے

پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

''قائداعظمؒ نے ملک وقوم کی خاطر اُس وقت حق کی آواز بلند کی جب کانگریسی لیڈر آزادی کا نام لیتے ڈرتے تھے۔ یہ صورت حال کافی مدت قائم رہی' بالآخر 1935ء میں برطانوی استعمار نے ہندوستان میں اپنی حکومت کی مدت کو طول دینے کے لیے قانون پاس کیا جسے 1935ء کا ایکٹ کہتے ہیں۔ اس وقت قائداعظمؒ نے محسوس کیا کہ مسلمان اس نیم برعظیم میں نہ صرف تعداد میں کم ہیں بلکہ ہر لحاظ سے بہت پسماندہ ہے۔ اگر یہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ قوم بالکل تباہ ہو جائے گی۔ قائداعظمؒ کے دل میں یہ تاثر پیدا ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کی تاریخی روایات یہ ہیں کہ اس قوم کو جب کبھی اقتدار حاصل ہوا' اس نے اقلیت کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ چنانچہ بدھ مذہب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس مذہب کا بانی ہندوستان میں پیدا ہوا اور اس کی تبلیغ سے کروڑوں انسانوں نے یہ مذہب قبول کیا مگر ہندوؤں کی تنگ نظری کے باعث اب ہندوستان میں اس مذہب کا نام ونشان تک نہیں۔ قائداعظمؒ نے ہندوؤں کی ان روایات کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا' اس لیے انہوں نے 1935ء کا ایکٹ پاس ہونے کے بعد مسلمانوں کو منظم کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے وہ ہندوستان کے کونے کونے میں گئے مگر بدقسمتی سے مسلم عوام نے ان کا بہت کم ساتھ دیا۔ بالخصوص پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں نے تو ان سے بہت مایوس کن سلوک کیا۔ مگر قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ 1937ء میں عام انتخابات ہوئے مگر مسلم لیگ کو بہت کم کامیابی ہوئی جس کی بنا پر کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے انہی دنوں ایک بیان میں یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں ایک انگریز اور دوسری کانگریس۔ اس موقع پر قائداعظمؒ نے ولولہ انگیز بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں ایک تیسری طاقت بھی ہے اور اس کا نام ہے مسلمان۔

اس بیان پر انگریز حکمران مسکرائے اور ہندو زعماء نے نفرت آمیز قہقہہ لگایا مگر خدائے بزرگ و برتر کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا یعنی غیر منظم مسلمان قائداعظمؒ کی مخلصانہ رہنمائی میں بیدار ہو گئے۔ 1940ء میں لاہور میں مشہور قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ اس قرارداد کے پاس ہو جانے کے بعد مخالفین نے اسے خواب اور سودا بازی قرار دیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم گاؤ ماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے مگر انہی لوگوں نے 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم منظور کی۔ اس تقسیم کے نتیجے میں اگرچہ مسلمانوں کو ان کا جائز حق نہ دیا گیا مگر غیر معمولی حالات کے پیش نظر قائداعظمؒ نے صدق دل سے یہ تقسیم منظور کر لی۔ دوسرے فریق نے بظاہر تو پاکستان کا قیام تسلیم کر لیا مگر بباطن وہ اس مملکت کی تخریب کے درپے رہا۔ چنانچہ اس نے ہمارے لیے مہاجرین اور کشمیر کے پیچیدہ ترین مسائل کے علاوہ دوسری متعدد مشکلات پیدا کر دیں مگر قائداعظمؒ نے نہایت بلند حوصلگی سے قوم کی رہنمائی کی جس کے نتیجے میں آج خدا کے فضل سے بہت سی مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے مگر دشمن نے اپنی سازشیں ختم نہیں کیں۔ ابھی پاکستان کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ کاش اس وقت قائداعظمؒ ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہوتے۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ قائداعظمؒ کے نقش قدم پر چل کر اپنے ملک کی حفاظت کرے"۔

آپ نے مزید فرمایا کہ "آج پنجاب کی حالت افسوس ناک ہے۔ کہیں صدارت کا جھگڑا ہے تو کہیں سیکرٹری شپ پر اختلاف ہے۔ کبھی اس بات پر تنازعہ ہے کہ ایڈوائزر ہونے چاہئیں یا نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر افتراق بدستور قائم رہا تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس وقت اتحاد اور اتفاق کی اشد ضرورت ہے۔ جو لوگ اختلاف کا موجب ہیں ان سے بھی دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا ترک کر دیں کیونکہ پاکستان تباہ ہو گیا تو نہ صرف اس نیم برعظیم کے مسلمان تباہ ہو جائیں گے بلکہ عالمِ اسلام کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اگر

آپ قائداعظمؒ کے نقشِ قدم پر چل کر بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لیے متحد العمل ہو جائیں تو انشاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔''

آخر میں ''قائداعظمؒ میموریل فنڈ'' کے لیے اپیل کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

''مرکزی کمیٹی نے تجویز کیا ہے کہ قائداعظمؒ کے ایک شاندار مقبرے کے علاوہ اُن کی یادگار کے سلسلے میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جائے اور ایک بلند پایہ ''دارالعلوم اسلامی'' اور ایک اعلیٰ ''دارالفنون'' بھی قائم کیا جائے۔ ان تجاویز پر عمل کرنے کے لیے کمیٹی کے اندازے کے مطابق تین کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ یوں تو قائداعظمؒ اپنی سب سے بڑی یادگار خود اپنی زندگی میں قائم فرما گئے ہیں اور وہ مملکتِ خداداد پاکستان ہے لیکن ہمارا بھی فرض ہے کہ اپنے محسنِ عظیم کے شایانِ شان یادگار قائم کریں۔ قوم کے ہر فرد کو قائداعظمؒ کے ساتھ جو والہانہ عقیدت ہے اُس کے پیشِ نظر اُمید کامل ہے کہ مطلوبہ رقم جلد از جلد جمع ہو سکے گی اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ پنجاب ہمیشہ کی طرح اس میدان میں بھی سب سے سبقت لے جائے گا۔''

(ماخوذ ہفت روزہ ''قندیل'' 13 ستمبر 1949ء)

پاکستانی پرچم کا پس منظر

سردار عبدالرب نشترؒ کا تحریر کردہ یہ مضمون پہلی مرتبہ ہفتہ روزہ ''چٹان'' میں 1953ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں پروفیسر رحیم بخش شاہین نے اپنی مرتبہ کتاب ''نقوشِ قائداعظمؒ'' میں شامل کیا جو مکتبۂ شاہکار لاہور نے شائع کی۔

''1947ء کو برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد تقسیم کے کام کے لیے پاکستان اور بھارت کے نمائندوں پر مشتمل کئی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔

ایک کمیٹی وزراء کی تھی جس کی صدارت گورنر جنرل کیا کرتے تھے۔ اس کمیٹی میں بھارت کی طرف سے آنجہانی پٹیل اور بھارت کے موجودہ صدر بابو راجندر پرشاد ممبر تھے

اور پاکستان کی طرف سے جناب لیاقت علی خان اور میں۔

چند یوم کے بعد جب سندھ کی صوبائی اسمبلی نے اعلانِ تقسیم کی شرائط کے مطابق تقسیم کے حق میں تجویز پاس کی تو پاکستان کی طرف سے قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ اور بھارت کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کمیٹی میں شامل کیے گئے۔

کمیٹی کے اجلاس عام طور پر صبح کے وقت وائسرائے کے گھر پر ہوا کرتے تھے اور سہ پہر کو پاکستانی نمائندے جناب قائداعظمؒ کے مکان واقع اورنگ زیب روڈ، دہلی پر مشورہ کے لیے جمع ہوتے تھے۔ وہاں پر صبح کے نتیجے اور آئندہ جلسے کے ایجنڈے پر غور کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مسائل کے متعلق بھی فیصلے کیے جاتے تھے۔

چنانچہ ایک دن قائداعظمؒ نے فرمایا کہ: وائسرائے نے ان کے ساتھ پاکستان کے پرچم کے متعلق بحث چھیڑی اور کہا کہ بھارت کے نمائندے تو اس بات پر رضامند ہیں کہ باقی نوآبادیوں کی طرح اپنے جھنڈے میں پانچواں حصہ برطانوی پرچم یعنی ''یونین جیک'' کے لیے مخصوص کر دیں۔

وائسرائے نے قائداعظمؒ سے پاکستان کے رویہ کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے رفقائے کار سے مشورہ کر کے وائسرائے کو مطلع کریں گے۔

میں نے عرض کی کہ: ہمیں یہ تجویز نہیں ماننی چاہیئے کیونکہ ہماری کیفیت باقی برطانوی نوآبادیوں سے جدا ہے۔ وہ ممالک برطانوی لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔ انہیں قدرتاً برطانوی جھنڈے سے خاص تعلق ہے۔ ہم تو برطانیہ کے قبضے سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور برطانیہ کے ساتھ نہ ہمارا نسلی تعلق ہے نہ مذہبی۔ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہوگا اور اس ملک کے پرچم میں ایک ایسے جھنڈے کو جگہ دینا جو ہماری غلامی کی یادگار ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں صلیب موجود ہے، ہماری قوم کو کیسے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

ہم سب اس پر متفق تھے کہ وائسرائے کی تجویز کو قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

چنانچہ قائد اعظمؒ نے وائسرائے کو اطلاع دے دی کہ بھارت کا جو بھی رویہ ہو' پاکستان متعدد وجوہ سے یونین جیک کو پرچم میں جگہ نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد یہ پوچھا گیا کہ: ''جھنڈے کے متعلق پاکستان کی کیا تجویز ہے؟''

چنانچہ اس سوال کو بھی قائد اعظمؒ نے ایک دن سہ پہر والے اجتماع میں پیش کیا۔ سب کی رائے یہ تھی کہ چونکہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے ہی حصول پاکستان کی تحریک کامیابی کے ساتھ چلائی گئی ہے' اس لیے پاکستانی پرچم میں اس کو تو رکھنا چاہیئے لیکن اقلیتوں کی نمائندگی کی بھی کوئی صورت نکالنی چاہیئے۔

بالآخر یہ طے پایا کہ چونکہ پاکستان میں کئی اقلیتیں ہیں' اس لیے سب کی نمائندگی کے لیے علیحدہ علیحدہ رنگ ونشان کے پرچم رکھے گئے تو موزوں نہ ہوگا۔ بجائے اس کے ایک حصہ سفید رکھا جائے جو سب رنگوں کا مجموعہ ہے۔ اس طرح سب اقلیتوں کی نمائندگی ہو جائے گی اور دوسرے پاکستانی پرچم میں سفید رنگ کا موجود ہونا ہمارے اسلامی ملک کی امن اور سلح کی پالیسی کا بھی مظہر ہوگا۔

جب اس سلسلے میں قائد اعظمؒ نے وائسرائے سے گفتگو کی تو اس نے مشورہ دیا کہ نیوی والے پرچم تجویز کرنے میں ماہر ہوتے ہیں' اس لیے اُنہیں کہا جائے کہ پاکستانی نمائندوں کے فیصلہ کے مطابق پرچم تجویز کریں۔

چند یوم کے بعد بحریہ والوں نے چھوٹے چھوٹے پرچم بنا کر بھیج دیے۔ کسی میں سفید رنگ دونوں طرف اور درمیان میں مسلم لیگ کا جھنڈا تھا۔ کسی میں سفید رنگ لکڑی کی طرف اور مسلم لیگ کا پرچم دوسری طرف اور کسی میں اس کا اُلٹ۔ چنانچہ ایک سہ پہر کو آخری انتخاب پرچم کے لیے چند نمونے پیش ہوئے۔ دونوں طرف سفید رنگ اور بیچ میں مسلم لیگ کے جھنڈے والا نمونہ تو بھلا نہیں لگتا تھا' اس لیے اسے تو رد کر دیا گیا' باقی دو نمونوں پر بحث ہوئی۔ بالآخر موجودہ پرچم کا انتخاب کیا گیا۔ علاوہ دیگر وجوہات کے اس کی تائید میں یہ

دو باتیں بھی تھیں کہ ایک تو مسلم لیگ کے جھنڈے والا حصہ اس طرف رہے گا جو ہوا میں اُڑتا ہے کیونکہ یہ خوبصورت نظر آئے گا اور دوسرے جو کپڑا جھنڈے کی لکڑی پر چڑھایا جاتا ہے وہ سفید رنگ کا ہوتا ہے اس لیے اس کے تسلسل میں سفید رنگ والا حصہ ہونا چاہیئے۔

دورانِ گفتگو قائداعظمؒ نے فرمایا کہ یہ بہتر ہوگا کہ پاکستان کے پانچ صوبوں کی نمائندگی کے لیے پرچم میں پانچ ستارے رکھے جائیں۔

میں نے عرض کیا کہ پاکستان کے ساتھ ریاستوں کا الحاق ہوگا نیز اور کئی وجوہات سے ہمارے صوبوں میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ اس لیے اگر یونٹوں کی تعداد میں تبدیلی واقع ہوگئی تو وقتاً فوقتاً ستاروں کی تعداد بدلنا پڑے گی اور اگر نہ بدلیں تو پانچ ستارے بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔

اس پر قائداعظمؒ نے مسکرا کر فرمایا: ''ایسی صورت میں ہم پانچ ستاروں کی توجیہہ یہ دیں گے کہ ان سے مراد ''پنج تن'' ہیں۔'' آخر یہی طے پایا کہ ایک ستارہ ہی رہے گا کیونکہ مسلم لیگ کے جھنڈے میں ایک ہی ستارہ ہے .....

بحریہ والوں کو اس انتخاب کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے وہ فارمولا تیار کر کے دیا جس کے مطابق پاکستان کا پرچم بنایا جاتا ہے۔ اگست 1947ء کو کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو لیاقت علی خان مرحوم نے یہ فارمولا اسمبلی کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نمونے کا پرچم بھی تھا جس کی نسبت یہ طے پایا کہ اسے بطور یادگار محفوظ رکھا جائے۔

کچھ عرصے بعد ایک اور نئی مشکل پیش آئی۔ غالباً اس وقت قائداعظمؒ رحلت فرما چکے تھے۔ پاکستان کے ٹکٹوں کے لیے مختلف حضرات سے تجاویز مانگی گئیں۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے وزارتِ مواصلات کو اطلاع دی کہ چاند کی وہ صورت جو پاکستان کے پرچم میں ہے ہلال کی صورت نہیں بلکہ اس وقت کی ہے جو چاند زوال پر ہوتا ہے یعنی قمری مہینہ کی

آخری ایام کی۔ یہ بات لیاقت علی خان مرحوم کے نوٹس میں لائی گئی۔ چنانچہ اُنہوں نے وزراء کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ وہاں یہ طے پایا کہ کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک تو پرچم میں تبدیلی مناسب نہیں۔ دوم تبدیلی کے لیے معاملہ ہر دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش ہوگا۔ تیسرے اگر ہم پاکستان کو اُردو رسم الخط کے طرز پر دیکھیں یعنی جھنڈے کو دائیں جانب رکھ کر تو چاند ہلال کی صورت میں نظر آئے گا۔ البتہ اگر اسے انگریزی رسم الخط کی طرز پر دیکھیں تو وہ اعتراض وارد ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ چنانچہ پرچم کو اسی صورت میں رہنے دیا گیا جس طرح مجلسِ دستور ساز میں فیصلہ کیا گیا۔''

اسلام کا نظریۂ تعلیم

سردار عبدالرب نشترؒ کا یہ خیال افروز اور فکر انگیز مضمون روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے ''نشترؒ ایڈیشن'' (فروری 1969ء) میں شائع ہوا تھا جو اس کتاب میں ''جنگ'' کے شکریے کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔

''ہمارا معاشرتی پس منظر ہمیشہ سے مذہبی رہا ہے۔ دنیاوی حقائق کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر اور تصورات وہی ہیں جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ ظاہراً اور باطناً خدا کی ذات پر ایمان رکھنا ہے۔ اس کی زندگی اپنے اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہو۔ خدا ان کے نزدیک سرتاسر حقیقت و رحمت ہے۔ وہ کریم ہے اور رحمٰن و رحیم بھی۔ مسلمانوں کے نزدیک کائنات خدا کی ان ہی دو صفات کا ایک نمایاں مظہر ہے۔ اپنی ذات اور کائنات میں اور قرآنی الفاظ سے ''انفس و آفاق'' میں مسلسل اور لگاتار حق کی صحت و جستجو کرتے رہنا اسلام کی اصل اسپرٹ ہے۔ ہم اس تصور کی بنیاد پر ایک ریاست کی تعمیر کرتے ہیں تو اسے کسی محدود مفہوم میں مذہبی (تھیاکریسی) نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح تعلیم کی بنیاد بھی اسی نظریے کو قرار دیں تو ہمارے علوم کوئی مذہبی عقائد کا ایک مجموعہ نہیں رہ جائیں گے۔ جس طرح حقیقت اور سچائی پر کسی ایک نسل کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی اسی طرح عدل اور محبت کو بھی کسی مذہب یا

فرقے کی جاگیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس موقع پر یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس کو اسلامی نظریے سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟ اس لیے ہم اس کو اسلامی کہتے ہیں' خواہ اس کا کچھ ہی نام کیوں نہ رکھیں۔ گلاب کے پھول کا آپ جو چاہیں نام رکھ لیں اس کی خوشبو وہی ہوگی۔

تعلیم کا قومی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی خاص نقطۂ نظر کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنا چاہتے ہیں تو لازماً وہی نقطۂ نظر ہماری تعلیمی پالیسی کی بنیاد بھی قرار پائے گا۔ ہمارا نقطۂ نظر اس قدر انسانی' کائناتی' عقلی' وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ تربیت و تعلیم کے لیے اسے ایک بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے کسی کو بھی عصبیت اور فرقہ پرستی کے لاحق ہونے کا خوف مسلط نہیں ہونا چاہیئے۔ اس یقین اور عقیدے کو ترقی دینے کی انسانیت نے جتنی بھی کوششیں کی ہیں انہیں اسلامی ہی کہا جائے گا۔ دنیا میں جہاں کہیں اس عقیدے کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی جدوجہد کی جا رہی ہے وہ اسلامی اسپرٹ کے عین مطابق ہے۔

دہریت اور مادیت کو خواہ وہ ظاہر ہو یا چھپی ہوئی ہو' اسے اپنی تعلیم میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ مادہ پرستی طلبہ کو اس کائنات کے بے مقصد ہونے کا درس دیتی ہے۔ اس کے نزدیک حق محبت اور رحمت اضافی اور فنا پذیر چیزیں ہیں۔ جسم' مادہ اور زندگی کو وہ ایک ہی چیز قرار دیتی ہے' روح کو ایٹم کی اتفاقی ترکیب کا نتیجہ سمجھتی ہے اور ایٹم کی حرکت اس کے پاس ایک اندھا میکانکی اور بے مقصد سا عمل ہے۔ زندگی کو اس کی ابدی اقدار سے محروم کرنے والے ان تمام تصورات کے خلاف ہم برسرپیکار ہیں۔ قدروں کی تخلیق کرنے والے قادر مطلق کا مقام ہم مادہ پرستی کو کسی صورت میں نہیں دے سکتے۔

ہم اپنے تعلیمی اداروں سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس مکروہ پروپیگنڈے کی قطعی طور پر مدد نہ کریں جو اسلام کو ناقابلِ عمل اور فرسودہ عقیدے اور نظریے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور نطشے کے گمراہ فلسفے ''خدا مر چکا ہے'' کا پرچار کرتا رہتا ہے۔

ہم ان درسگاہوں سے اس بات کا بھی تقاضا کرتے ہیں کہ ان تہذیبی کارناموں کو نمایاں کریں جو مسلمانوں نے انسانیت کے معاشرتی ارتقاء کے لیے انجام دیے ہیں تا کہ ہماری قوم اور ہماری جدید نسل اپنے تہذیبی ورثے سے پوری طرح آشنا ہو سکے اور مستقبل میں اس سے بھی زیادہ عظیم خدمات انجام دینے کے لیے مستعد ہو جائے اور ترقی پذیر انسانیت کے ہراول دستے میں شامل ہو سکے۔

یہ کوئی جامد مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک جاندار و متحرک نظریہ ہے۔ اس کا سرچشمہ اسلام ہے۔ بے جان مذہبی عقیدوں اور محدود مذہبیت جیسی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔ حق کی وحدت' محبت کی عالمگیریت' انسانیت کا استحکام' یکجہتی اور تمام ابدی اقدار کی حفاظت اس کے اصول ہیں۔ یہی اسلام کے نظریات و تصورات ہیں جو صرف اسلام ہی کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ قرآن اور اسلام کی رُو سے سچائی ایک عالمی حقیقت ہے۔ خودغرض گروہوں اور فرقوں کی تنگ نظری اور اندھاپن اپنے لیے نئے نئے حقوق اور اجارہ داریاں تجویز کرتا رہا ہے۔

ہمارا دور علم اور سائنس کا دور ہے۔ اسے فطرت کی قوتوں اور طاقتوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے علمی اصولوں اور طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ دُنیا کی جن قوموں نے فطرت کی سائنسی تسخیر میں حصہ نہیں لیا' وہ ہمیشہ پسپا ہوتی رہی ہیں اور زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکیں۔ تہذیب و تمدن کے دائرے میں شاندار اور عظیم روایات رکھنے والی قومیں اپنی روحانی اور اخلاقی اقدار کی تجدید' احیاء اور تعمیر کے ساتھ خالص اور عملی سائنس کی طرف بھی توجہ دیتی رہی ہیں۔

رُوح مادی دُنیا کے اسٹیج ہی پر نمودار ہو کر اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ ہماری اخلاقی قدروں کا سرچشمہ رُوح ہی ہے۔ گوشت پوست اور خون سے بنے ہوئے جسموں کے ساتھ ہم زندگی بسر کرتے ہیں' اسی لیے ہماری اخلاقی و رُوحانی قدروں کا ہماری زندگی میں بھی جلوہ گر ہونا ضروری ہے۔

رُوح اور مادے کی ثنویت ایک اعلیٰ ترکیب کے مرحلے میں پہنچ جاتی ہے جہاں مادہ اخلاقی اور رُوحانی قدروں سے مل کر رُوحانیت اختیار کر لیتا ہے اور رُوح واقعیت کا لباس پہن کر ایک ٹھوس صورت اختیار کر لیتی ہے اور ان دونوں کی جدائی ایک دوسرے کو کمزور کر کے رکھ دیتی ہے لیکن جب ایک کا رشتہ دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے تو زندگی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ بعض پرانی تہذیبوں نے مادے کو داؤ پر لگا کر رُوح کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی لیکن گزشتہ دو صدیوں کے دوران معاملہ بالکل دوسری انتہا پر پہنچ گیا اور انسانیت فطرت کی طاقتوں پر غلبے اور فتح کے نشے میں چور ہو کر نہ صرف یہ کہ رُوح کو نظر انداز کرنے لگی بلکہ اس کے وجود ہی سے منکر ہو گئی۔ ان دونوں ہی صورتوں میں انسان نے ان چیزوں کو الگ کرنے کی کوشش کی تھی جن کو خدا نے باہم جوڑ دیا تھا۔ انسانیت کی آئندہ کامیابیوں کا انحصار لازماً رُوح اور مادے کی ایک ایسی ترکیب پر ہونا چاہیئے جس میں ان دونوں متضاد چیزوں کی لازمی اقدار پوری طرح شامل ہوں .....

پروفیسر گب نے بالکل صحیح کہا ہے: ''اسلام مشرق و مغرب کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنے کا فرض سب سے زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتا ہے۔''

قرآن میں بھی مسلمانوں کو اُمتِ وسط کے نام سے یاد کیا گیا ہے یعنی وہ ایک ایسی قوم ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں انتہا پسندی سے کنارہ کش رہتی ہے۔ مغربی اقوام نے فطرت کی زبردست طاقتوں کو دریافت کر لیا ہے۔ فطرت کی یہ طاقتیں ایک غیر جانبدار فریق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ نہ تو اخلاقی ہوتی ہیں اور نہ غیر اخلاقی۔ ان کے نفع اور ان کی مضرت کا انحصار انسان کے اپنے طرزِ عمل پر ہوتا ہے۔

انسانی نقطۂ نظر سے مستقبل کی عظیم قومیں وہ ہوں گی جو فطرت کی طاقتوں کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنانے کے راز سے واقف ہو جائیں گی لیکن دنیا میں کوئی قوم فطرت کی طاقتوں اور قوتوں کو نظر انداز کر کے صحت مندانہ باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

سائنس کو ترقی اور عروج پر پہنچانا بھی ضروری ہے تا کہ انسان فطرت کی لامحدود قوتوں اور وسائل سے فائدہ اُٹھا سکے۔ اپنے آپ کو ہر طرح کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔

تعمیر وتجدید کی کوئی بھی تحریک یا کوشش اس وقت تک قدر و قیمت کی حامل نہیں ہوسکتی جب تک کہ رُوحانیت کے ساتھ اس کے لیے سائنسی اور علمی بنیادیں نہ فراہم کی جائیں۔ سائنسی علم کے میدان میں ہم کو دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ علم کی کوئی تاہلِ قدر خدمت انجام دینے سے پہلے ہم کو اس سائنسی اور علمی کام سے مطابقت پیدا کرنی ہوگی جو بہت بڑے پیمانے پر پہلے ہی انجام دیا جاچکا ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہم کو علم کے حصول اور جستجو کے لیے دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ علم کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی فروتنی کو کبھی بھی احساسِ کمتری کے معنے نہیں پہنائے جاسکتے۔ جبلی یا پیدائشی طور پر کوئی قوم عظیم ہوتی ہے اور نہ کمتر و پست۔ یہ تو تاریخ اور زمانے کے نشیب و فراز ہیں جو ایک کو آگے بڑھا دیتے ہیں تو دوسرے کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔

سائنسی ترقی کے راستے پر تیزی سے قدم بڑھانے کے دو ہی طریقے ممکن ہیں۔ حصولِ علم کے لیے ہم کو ملک سے باہر جانا ہوگا یا ایسے ماہرین کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو پاکستان میں رہ کر ہمیں تعلیم دے سکیں اور سکھا سکیں۔ پہلا طریقہ نسبتاً آسان ہے کیونکہ ترقی یافتہ قومیں اپنے بہترین صلاحیتیں رکھنے والے افراد کو اس فیاضی کے ساتھ ترقی پذیر ممالک کے خیر خواہان مشن کے لیے فارغ نہیں کرسکتیں۔ وہ بادل ناخواستہ اپنے دوسرے یا تیسرے درجے کے کچھ ذہین افراد بھیج دیا کرتی ہیں۔ اس معیار کے ماہرین کو تو ہم خود اپنے ملک میں تیار کرسکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے موزوں طلبہ اور ماہرین کو تعلیم و تربیت کے لیے غیر ممالک بھیجنا ہوگا جہاں کچھ عرصے رہ کر وہ اعلیٰ درجہ کے ماہرین سے

تربیت حاصل کر سکتے ہیں پھر واپس آ کر خود ملک کے دوسرے افراد کو تیار کر سکتے ہیں۔

اعلیٰ سائنسی تحقیق اور تعلیم کے لیے استعمال ہونے والے آلات اور مشینیں بہت زیادہ مہنگی ہوتی ہیں۔ اقتصادی طور پر بدحال قومیں اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتیں لیکن اس اہم قومی ضرورت کی خاطر ہم کو پوری طرح اپنے وسائل سے کام لینا ہوگا اور بہت سے شعبوں میں ہم کو سخت محنت اور جدوجہد کرنی ہوگی۔ اسی طرح ہم سائنسی تربیت حاصل کر سکتے ہیں لیکن بہترین خواہشوں کو دل میں پالتے رہنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اپنی سائنسی، صنعتی اور فنی ضروریات کا جائزہ لے کر قابلِ عمل منصوبے بنانا بھی ضروری ہیں۔ کسی بھی مہذب ملک کی حکومت اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں کسی طرح کی بھی کمی کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتی۔ سائنسی اور صنعتی تعلیم ہم میں خود اعتمادی پیدا کرے گی۔ ہمارا ملک نہ صرف خود مکتفی ہو جائے گا بلکہ ہم بہت بڑی مقدار میں ایسے وسائل بھی پیدا کر سکیں گے جن کی مدد سے ایک ہمہ جہتی سماجی اور تمدنی ترقی کو روبہ عمل لایا جا سکے گا۔

اتفاق اور یک جہتی

سردار عبدالرب نشترؒ کی یہ تقریر انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں کی تھی اور ''قومی زبان'' کراچی کے شمارہ یکم ستمبر 1955ء میں شائع ہوئی تھی:-

''یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مشکلات ہر قوم ہر ملک کے سامنے آیا کرتی ہیں۔ کچھ ملک والوں کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے کچھ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث اور کچھ قدرتی حالات کے نتیجے کے طور پر لیکن باہمت قومیں عام طور سے مشکلات پر قابو پا لیا کرتی ہیں بشرطیکہ وہ اتفاق اور یک جہتی سے ان مشکلات کو دور کرنے کی سعی کریں۔ ان کے حل کے لیے صحیح راستہ اختیار کریں اور اس سلسلہ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔ پاکستان اگر اپنی مشکلات پر اس

وقت تک قابو نہیں پا سکا تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ چند سال سے یہاں کی حکومت اور قوم کے درمیان تعاون نہیں۔ حکومت والے عوام کی طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ دوسرے طریقوں سے حکومت پر قبضہ کرتے رہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کے چلانے میں عوام کا اعتماد حاصل کرنا کوئی ضروری بات نہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ عوام کی تائید حاصل کرنا چاہیئے تو ایسی تجویز کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ایسے رویے کے باوجود دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جمہوری اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس غیر جمہوری طرزِ حکومت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عوام حکومت کے ہر کام کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جس پارٹی کے لوگ برسر اقتدار ہوں اس کے افراد بھی عام طور پر حکومت والوں پر تنقید ہی کیا کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ باقی جماعتوں کے عہدہ دار بھی حکومت اور پارٹی دونوں کے عہدوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مسلم لیگ جو سب سے بڑی جماعت تھی اور اب بھی غالباً دوسری بڑی جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع سمجھی جاتی ہے کیونکہ پاکستان کے دونوں حصوں میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔ اس میں تو ایک مستقل رسم قائم ہوگئی ہے کہ جس شخص کو گورنر جنرل یا صوبے کا گورنر وزیر اعظم مقرر کردے جماعت کا وہی صدر بن جاتا ہے اور جسے وزارت سے ہٹا دیا جائے اسے صدارت کو بھی خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ گویا مرکزی اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر حقیقتاً بہ لحاظ عہدہ صدر مقرر ہوتے ہیں نہ کہ ممبروں کے انتخاب سے۔ اس افسوسناک طریقۂ عمل سے ملک کی سیاسی جماعتیں کمزور ہوگئی ہیں اور نتیجتاً منظم رائے عامہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ رائے عامہ تو ہر وقت موجود رہی لیکن ایک منتشر ہجوم کے مخالفانہ نعروں کی صورت میں۔ اندریں حالات میری ناقص رائے میں اس امر کی اشد اور فوری ضرورت ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کو جمہوری بنیادوں پر منظم کیا جائے تاکہ وہ عوامی جماعتیں کہلانے کی مستحق ہوں اور وہ منظم طریقے پر ہم خیال طبقے کی نمائندگی کرسکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم کوشش کریں اور

کامیاب نہ ہوں کیونکہ ہمارے سامنے قائداعظمؒ کے عہد کی مسلم لیگ کی مثال موجود ہے تو میرے دل میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کی حکومتوں کی تشکیل وتبدیلی جمہوری اصولوں پر ہوگی۔ اُن کے اعمال کا محاسبہ بھی صحیح طریقے سے ہو سکے گا۔ حکومت کو اس طرح سے عوام کا دلی تعاون حاصل ہو سکے گا اور جب یہ حقیقی تعاون حکومت کو حاصل ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی اکثر وبیشتر مشکلات پر آسانی سے کیوں نہ قابو پا سکیں۔

دنیا کے موجودہ ممالک میں کئی ایسے ممالک ہیں جن کو گزشتہ چند سالوں کے اندر ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کے مقابلے میں ہماری مشکلات کی کوئی حقیقت نہیں لیکن قوم اور حکومت کے باہمی تعاون کی برکت سے وہ اپنے کئی مسائل حل کر چکے اور باقی جو ہیں ان کے حل کرنے کے درپے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم لوگ اس سیدھی سی بات کو سمجھ سکیں اور خودغرضانہ حرکات چھوڑ کر اس صحت مند راستہ کو اختیار کر لیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو انشاءاللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟..... اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر ایک کو اپنا ضمیر سُنول کر دینا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

نشترؒ کی شاعری

ایک سیاسی رہنما اور ایک وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ سردار عبدالرب نشترؒ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے اُن کی ادبی خدمات کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے: ''طبعاً شاعر' لیکن عادتاً شعر کہنے سے محترز' قلم میں بانکپن اور زبان میں لوچ ہے۔ قدرت نے اُن میں سب ہی خوبیاں بیک وقت جمع کر دی ہیں۔ شاعر ہیں' ادیب ہیں' خطیب ہیں' سیاست داں ہیں''۔ انہوں نے صرف اردو ہی میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ فارسی اور پشتو زبان میں بھی اپنے واردات و مشاہدات کو نظم و غزل کا جامہ پہنایا ہے۔ اُن کا کلام اُن کے مطمحِ نظر اور فلسفۂ حیات کا ترجمان ہے۔ ان کی زندگی کے بلند عزائم اور اعلیٰ نصب العین اُن کی شاعری سے بخوبی مترشح ہوتے ہیں۔ نشترؒ نے نہ صرف عملی طور پر سیاست میں حصہ لے کر ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے مناسب اقدامات کیے بلکہ افرادِ قوم کی روحانی و ذہنی تزکیے کے لیے ایسے اشعار بھی لکھے جن سے قومی شاعری کا پلّہ گراں ہو جاتا ہے۔

وکالت کے پیشے نے سردار نشترؒ کو اتنا موقع فراہم نہیں کیا کہ وہ قومی و ملی شاعری میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ نہ سیاسی سرگرمیوں ہی نے اتنی مہلت دی کہ وہ اطمینان و سکون سے شاعری کی طرف توجہ دے سکتے۔ اس کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملا' وہ شعر گوئی سے غافل نہیں رہے اور گاہے گاہے اپنے وسیع مشاہدات اور گوناگوں قلبی واردات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے رہے۔ اُنہیں شاعری کا ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ بچپن ہی میں طبیعت موزونیت اور موسیقی کی طرف مائل ہوگئی تھی۔

اُنیس بیس برس کی عمر میں با قاعدہ شروع کر دی تھی۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ انہوں نے جوانی میں کثرت سے اشعار کہے لیکن افسوس ہے کہ اُن کا بہت سا کلام 1920ء کی آتش زدگی میں ضائع ہو گیا۔

جناب نشترؒ کو اُردو کے مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنی شعر گوئی کے ابتدائی ایام میں اُنہوں نے اکبر مرحوم کو اپنا کلام اصلاح کے لیے دکھایا۔ تلمذ کا یہ سلسلہ اکبر کی وفات تک جاری رہا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں: ''ابتدائی ایام میں دو تین سال حضرت اکبر الہ آبادی سے اصلاح لیتا رہا۔ دو ایسی اصلاح شدہ غزلیں اس مجموعے میں درج ہیں۔ افسوس ہے وہ کاغذات جن پر اصلاح اُن کے قلم سے درج تھی' 1920ء کی آتش زدگی میں ضائع ہو گئے۔ 1921ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے اصلاح کا یہ سلسلہ جلد ہی منقطع ہو گیا''۔

جناب نشترؒ نے اس نوع کی پہلی ملّی نظم بیس سال کی عمر میں ''تحریکِ خلافت'' سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ واضح رہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکوں کی حمایت میں برصغیر کے مسلمانوں نے یہ تحریک شروع کی تھی۔ اتحادی قوتوں نے ترکوں سے سیورے کے مقام پر جو معاہدہ کیا تھا' اُس کی شرطیں بہت سخت تھیں۔ اُس کی رُو سے ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس معاہدے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند سخت برہم اور برانگیختہ ہو گئے تھے۔ اُس وقت کے عظیم قومی رہنما مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی' حکیم اجمل خان' مولانا ظفر علی خان' نواب محمد اسماعیل خان' ڈاکٹر انصاری اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ اس تحریک میں شامل تھے۔ خلافت کی اس تحریک نے پشاور سے پدما تک اور کوہِ ہمالہ سے راس کماری تک مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ بچہ بچہ اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر انگریزوں کے استبداد کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے ہی جاں فروشوں میں صوبہ سرحد کے نوجوان شاعر سردار نشترؒ بھی تھے۔ انہوں نے اُس زمانے میں یہ نعت بحضورِ سرورِ کائنات ﷺ بطور ہدیۂ عقیدت پیش کی ؎

شب و روز مشغول صلِ علیٰ ہوں
میں وہ چاکرِ خاتمِ انبیا ہوں

نگاہِ کرم سے نہ محروم رکھیو
تمہارا ہوں میں، گر بھلا یا بُرا ہوں

مجھے بھی ہو معراج، معراج والے
میں دیوانہ لیلائے معراج کا ہوں

میرے لحن پر رشک، داؤد کو ہے
مدینہ کی گلیوں کا نغمہ سرا ہوں

نہ کیوں فخر ہو عشق پر اپنے، مجھ کو
رقیب خُدا، عاشقِ مصطفےٰ ﷺ ہوں

میں ہوں ہر دو عالم سے آزاد نشتر
گرفتارِ زلفِ رسول ﷺ خدا ہوں

11 نومبر 1921ء

تحریکِ خلافت کے دوران اُنہوں نے 1919ء میں ایک غزل کہی جو اُن کی اولین دور کی یادگار ہے۔ ملاحظہ کیجئے ۔

دستِ اعدا کے تظلّم سے جہاں میں باقی
کیا گریباں خلافت کا کوئی تار بھی ہے

تیرے وعدے پر یقیں کس طرح آئے ہم کو
اب اقرار میں پنہاں ترا انکار بھی ہے

کہتی ہے دشمنِ ایماں سے یہ تیغِ تُرکی
تری سرکار سے بڑھ کر کوئی سرکار بھی ہے

ہاں زلیخا منشی کی ہے ضرورت ورنہ
حُسنِ یوسف بھی ہے، مصر کا بازار بھی ہے

رنگ لائے گا یہ فریاد کا طوفاں نشتر
چشمِ خوں بار بھی ہے اور آہِ شرر بار بھی ہے

.....☆☆.....

جناب نشترؒ اسلام کے سچے شیدائی تھے۔اُن کے دل میں اُمتِ مسلمہ کا درد موجزن تھا۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم وتشدد ہوتا، مرحوم تڑپ اُٹھتے اور اُن کے قلبی تاثرات اشعار کے آئینے میں جلوہ گر ہو جاتے۔اُنہوں نے اِس نوع کی ایک طویل معرکۃ الآرا نظم "قصیدۂ دردِ اسلام" کے عنوان سے لکھی۔اُس نظم کے چند ابتدائی اشعار

میں ہوں کیا، جا کر تو درۂ خیبر سے پوچھ
تختِ کسریٰ سے، ذرا مرقدِ قیصر سے پوچھ

چین میں جا کے پتا تُو میری عظمت کا لگا
مصر کے شہر سے مینار سے منبر سے پوچھ

مجھ سے پہلے تھا عرب ایک فقط ریگستان
خار سے پوچھ، بیابان کے پتھر سے پوچھ

میرے آنے سے وہ مسجود بنا عالم کو
تُو کسی شہر، کسی شخص، کسی گھر سے پوچھ

خوب معلوم ہے یورپ کے کلیساؤں کو
میری سطوت، نہیں تو ہند کے مندر سے پوچھ

ایک جگہ جناب نشترؒ نے مسلمانوں کے بلند کردار و اخلاق کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مستی نشۂ توحید سے سرشار تھے وہ
فوج کفار سے لڑتے تھے، نڈر اور بے باک

تختِ کسریٰ کی بھی اُن کو نہ ہوس ہوتی تھی
نہ میسر تھا جنہیں سونے کو جُز فرشِ خاک

.....☆☆.....

اس کے بعد نشترؒ افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلام کی سابقہ عظمت و رفعت برقرار نہ رہی۔ مسلمانوں نے مغربی زندگی، زاویۂ نگاہ اور فکر و خیال کو جزوِ ایمان بنالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

اُن کی ساکھ ختم ہوگئی ۔اُن کا جاہ وجلال جاتا رہا۔ اُن کی سطوت وشوکت کے نشان مٹ گئے ۔نشترؒ مرحوم ملت کے اس سانحے کو بڑے دردانگیز پیرایے میں بیان کرتے ہیں ۔

اپنے اجداد کا' ان میں نہ رہا کوئی نشان
نہ عرب کی وہ جلادت' نہ ہے ترک کی تاز

وہ فدا ہوتے تھے اک دوسرے پر دل سے' مگر
یہ ہیں ایک دوسرے کے دشمن جان و غماز

اُن کو تعلیم پہ قرآن کی ہوتا تھا فخر
ان کو ہے شکسپیئر کی تصانیف پہ ناز

.....☆☆.....

پھر شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام کے ظہور سے کفر کی ظلمت کافور ہوئی ۔ ہر جگہ توحید کا علم بلند ہوا۔ تثلیث کا شیرازہ ضربِ مسلم سے بکھر کر رہ گیا۔ اسلامی شان وشوکت کے آگے سارے ارضی خداؤں کے بُت منہدم ہوگئے ۔

کئی حصے میں جہاں کے تھی مروج تثلیث
مانتا تھا کوئی عیسیٰ کو کہ یہ ہے ابنِ عہد
اس پر بھی جو نہ کرتے تھے کفایت واں تھا
سینکڑوں' لاکھوں' کروڑوں پہ خداؤں کا عدو

میری طاقت تھی کہ تثلیث ہوگئی سہ پارہ
جبکہ دنیا میں چلی تیغ ھُو اللہ احد

لَم یَلِد کی تعلیم ہوئی میسر مجھ کو
دہر نے مجھ سے پڑھا ہے سبق لَم یُولَد

مرحوم نشترؒ کے چند اور اشعار بطور نمونہ کلام پیش ہیں۔

گھبرا نہ زمانے کی مصیبت سے ذرا
اے غزوۂ دِل' ہار نہ ہمّت اصلا

.....

تڑپ کر زندہ ہو جاتے ہیں بے جان اُس کے سننے سے
صدائے ''قُم باذِنی'' ہے کہ یا نشترؒ غزل خواں ہے

.....

اسلام کے شیروں کو جگاتے ہو لیکن
جھنجھلا کے کہیں کُفر کی ہستی نہ مٹادیں

.....

ڈرتے رہو' توحید پرستوں کے غضب سے
پھر غوری و محمود تمہیں بن کے دکھادیں

میرا مذہب ہے محبت میں تڑپتے رہنا
میرا ایمان نہ رہے' دل جو تڑپتا نہ رہے

.....

بس اتنی سی خطاء پر رہبری چھینی گئی ہم سے
کہ ہم سے قافلے منزل پہ لُوٹائے نہیں جاتے

.....

چند رُباعیات

ہاں بتا دیجئے سرگرم تکلم ہو کر
رہ گئی لب پہ کوئی بات تبسم ہو کر
عشق کی راہ عجیب، اس کی روایات عجیب
منزلِ یار تو ملتی ہے مگر گم ہو کر

(1933ء)

یوں بیت گئی ساری جوانی عمر اہ
ہے شام و سحر گنہ، شب و روز گنہ
لے کر میرے بالوں کی سیاہی نشترؔ
لکھتے ہیں میرا نامۂ اعمال سیہ

(1943ء)

رستے میں ہو دریا کہ بیاباں آجائے
آندھی چلے، بجلی گرے، طوفان آ جائے
زنہار نہ لغزش تیرے قدموں میں کبھی
اے رہرو! کوچۂ جاناں آ جائے

(1943ء)

ساقی کے اشارے پہ پیا کرتا ہوں
رحمت کے سہارے پہ پیا کرتا ہوں
یہ اُس اب شیریں کا ہے صدقہ نشترؔ
کوثر کے کنارے پہ پیا کرتا ہوں

(1943ء)

مگر اِس دورِ ضلالت کا ہے نزدیک انجام
صبح ہونے کو ہے اب جلد یہ غفلت کی شام
خواب سے اُٹھنے کو انگڑائیاں لیتے ہیں سبھی
جلد خورشید نظر آئے گا بالائے بام
مُرغ ایمان رہا ہووے گا انشاء اللہ
چارہ ہوجائے گا یکبار یہ کُفر کا دام
پھر وہ ایام بہت جلد نظر آئیں گے
کہ ہو قرآن کی تعلیم زمانے میں عام
اُٹھو زندانِ خرابات عرفاں سب اُٹھو
مفت ملتا ہے ہر اک کو مئے توحید کا جام

☆☆

کیا پڑھوں میں اب بزمِ ادب میں نشتر
جب کہ ہے رزم کے ہاتھوں سے جہاں زیر و زبر
نہ وہ پہلی سی طبیعت، نہ وہ عالم باقی
نہ وہ مے خانہ ہی باقی ہے نہ باقی ساقی
نہ وہ پہلا سا چمن، نہ وہ پہلی سی بہار
پُھول مُرجھا گئے، خاموش ہوئی بلبل زار
زلفِ لیلیٰ میں نہ وہ پیچ نہ وہ خم ہی رہا
دلِ مجنوں میں نہ وہ جوش نہ وہ دم ہی رہا
گرچہ ہے تیشۂ فرہاد مگر تیز نہیں
حسنِ شیریں تو ہے، لیکن وہ دلآویز نہیں

نجد سے جانبِ لیلیٰ جو ہوا آتی تھی
دلِ مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی تھی
اب جہاں خطۂ یورپ سے ہوا جاتی ہے
دندناتی ہوئی توپوں کی صدا آتی ہے
تھی یہ اُمید کبھی ابرِ کرم برسے گا
اب تو ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ بم برسے گا
تارپیڈو کہیں چلتا ہے کہیں گولا ہے
منہ سمندر نے جہازوں کے لیے کھولا ہے
تیغ دشمن سے جوانوں کے گلے کٹتے ہیں
مامتا ماری ہوئی ماؤں کے دل پھٹتے ہیں
کہیں فریاد تڑپتے ہوئے معصوموں کی
کہیں بیواؤں کے نالے ہیں کہیں سینہ زنی
عالم اس فکر میں ہے ایسی کچھ ایجاد کرے
نوعِ انسان کو بہت جلد جو برباد کرے
کیسی دنیا پہ قیامت ہے عیاذاً باللہ
ہے یہی دورِ ترقی کا تو اناللہ
رخِ خورشید سے ظلمت کو ہٹانے والے
مُردہ دنیا کو نئے سرے سے چلانے والے
راہِ گم گشتہ بھٹکتے ہیں جہاں میں انسان
خضر کو بھیج، بتادے اُنہیں منزل کا نشان
روحِ انسان کو ترے لُطف سے مل جائے قرار

اِس خزاں دیدہ چمن میں بھی پھر آجائے گا بہار
نسل اور رنگ و وطن، قوم کے جھگڑے مٹ جائیں
راگ میٹھا تیری عظمت کا، سب مل کر گائیں

.....☆☆.....

تیرے ساتھ ہو جس سے رابطہ وہی چیز لائقِ نیاز ہے
مجھے بندہ ہونے پہ فخر ہے، تیری ذات بندہ نواز ہے
مجھے بزمِ دہر کے راز نہ پتا لگا نہ پتا لگا
کوئی گرمِ نخوت و ناز ہے، کوئی محوِ عجز و نیاز ہے
تیرے فیضِ عام سے بہرہ نہ ہو، اگر تو میری خطا
میرے ہاتھ کی ہے یہ کوتہی، ارے بے خبر کہ میرے لیے
کروں ترکِ عشقِ بُتاں میں کیوں، ارے بے خبر کہ میرے لیے
ہے حقیقت اِس میں ہی جلوہ گر، تیرے واسطے جو مجاز ہے
وہی عشق ہے، وہی حسن ہے، دلِ عاشق و رُخِ یار میں
یہ کرشمے ہیں اُسی ایک کے، کہیں سوز ہے کہیں ساز ہے
کسی عیب ہیں کو ہے کیا خبر، جو ہے پوچھتا تو یہ پوچھو تو
دلِ غزنوی سے ذرا کہ واقف رمزِ حُسن ایاز ہے
میں پڑا ہوں ظلمت ہجر میں، نگہِ کرم کی اُمید پر
کہ اے آفتابِ جہاں کرم، تیرا نام ذرہ نواز ہے
ہے وہ چاٹ ساغرِ عشق کی، جو نہ جائے گی کبھی واعظ
مجھے اس سے کچھ نہیں فائدہ، درِ توبہ کیا ہے جو باز ہے
کروں نشتر اپنا بیان میں کیا، میرا حال کیا ہے فراق میں
ہوں وہ شمعِ خلوتِ بے کسی کہ جو وقتِ سوز و ساز ہے

اہلِ قلم کا خراجِ تحسین

سردار عبدالرب نشترؒ کی قومی، سیاسی اور ادبی خدمات اور اُن کے ذاتی اخلاق و کردار اور اوصافِ حمیدہ کی تعریف و تحسین میں تقریباً ہر زندہ سیاست دان، صحافی حضرات اور اہلِ قلم نے اتنے مضامین نظم و نثر اور اخباری کالم تحریر کیے ہیں کہ اُن سب کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ اس مختصر سی کتاب میں اُن سب کی شمولیت ممکن نہیں، اگرچہ اُن سب کے مضمون کا خلاصہ اپنے اپنے مقام پر درج ہو چکا ہے۔ تاہم یہاں تین بڑے ادیبوں کے مضامین بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:-

آغا شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد نے وزارتی مشن کے زمانے میں راقم الحروف سے کہا تھا کہ اگر مسلم لیگ کا مزاج عبدالرب نشترؒ کی سطح پر ہوتا تو مفاہمت کے دروازے پر دستک دینے میں زیادہ آسانی ہوتی لیکن پھر انہوں نے خود ہی ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا:-

''میرے بھائی! سیاسیات کے جھمیلے انسانی دلوں کے درمیان کچھ ایسی دیواریں چن دیتے ہیں کہ ان کی سنگینی کو عہدِ عتیق کی دیوارِ چین بھی نہیں پہنچتی ہے''۔

وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجمل خان اور مولانا کے پرنسپل سیکرٹری آ گئے اور کہا:

''جے پرکاش آئے ہیں''۔ اور اس طرح ایک اچھی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خواجہ حسن نظامی نے کسی دوست سے کہا تھا، نشترؒ قد و قامت کے اعتبار سے ''قطب صاحب کی لاٹھ اور رنگ و روغن کے لحاظ سے ''تاج محل'' ہیں۔ دراز قامت، گورا رنگ، دوہرا بدن، خوش پوشاک اور خوش گفتار، موج کی طرح چلتے اور صبا کی طرح بولتے ہیں۔ ایک دوست کا

خیال ہے کہ ان کی گھنی اور لمبی مونچھیں ان کے کتابی چہرے پر قرار داد مقاصد کی طرح خوشنما معلوم ہوتی ہیں۔

طبعاً شاعر لیکن عادتاً شعر کہنے سے محترز، قلم میں بانکپن اور زبان میں لوچ ہے۔ قدرت نے ان میں بہت سی خوبیاں بیک وقت جمع کر دی ہیں' شاعر ہیں' ادیب ہیں' خطیب ہیں' سیاست دان ہیں۔ قائداعظمؒ زندہ تھے تو ان کے معتمد علیہ تھے۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ آج کی قیادت میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان سے زیادہ قائداعظمؒ کے قریب رہا ہے۔ لیکن جدید کابینہ کی کوئی تصویر چھپتی ہے تو بالا بلند نشترؒ کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غیر مرئی حروف میں کہہ رہی ہو۔ ''دراز دستی ایں کوتاہ آستیناں ہیں''۔

نواب بہادر یار جنگ کے بعد وہ مسلم لیگ کے واحد عوامی مقرر ہیں۔ ان کی خطیبانہ استعداد کو حاکمیت کی بعض مسئولیتوں نے کسی قدر گزند ضرور پہنچایا ہے لیکن اب بھی..... شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

نشترؒ نے سیاست کے سفر میں بہت سی وادیاں قطع کی ہیں۔ انہیں مولانا محمد علی جوہر سے ذہنی تلمذ ہے' وہ تحریک خلافت میں ان کے ہم نوا تھے۔ بادشاہ خان سے اختلافات پیدا ہو گئے تو کانگریس کو چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں انہوں نے جیل یاترا بھی کی۔ خاکساروں سے دلچسپی کو قائم رکھا۔ اتحادِ ملت کے دوستوں سے بھی تعلق استوار رہا' سید عطا اللہ بخاری سے ذاتی مراسم کو عمر بھر مجروح نہیں ہونے دیا۔

قائداعظمؒ نے 1936ء میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑا اٹھایا تو سرحد میں آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے قائد کی آواز پر لبیک کہا' وہ سرحد میں قائداعظمؒ کے نائب سمجھے جاتے تھے۔ ''پرتاپ'' نے ایک دفعہ لکھا تھا:-

''پنجاب کے جینا کا نام برکت علی ہے اور سرحد کے جینا کا نام عبدالرب نشترؒ''

آج بھی مسلم لیگ کے نو ساختہ رہنماؤں میں اگر کسی شخص کے لیے ملک کے عوام میں قدر و منزلت کے جذبات باقی ہیں تو وہ صرف نشترؒ کے لیے ہیں۔ ان کی اس مقبولیت پر ان کے ساتھی حسد کرتے' ان کے دوست خوش ہوتے ہیں۔

نشترؒ خدا پرست ہی نہیں' پیر پرست بھی ہیں۔ ان کے روحانی مرشد حضرت شاہ محمد غوثؒ کا مزار دہلی دروازے کے باہر' دفتر احرار کے بالمقابل واقع ہے اور ان کے مزار پر تاریخ وصال کا جو سنگی قطعہ لگا ہوا ہے' وہ نشترؒ ہی کی فکر کا نتیجہ ہے۔

نشترؒ نے اپنے اس احساس کو کبھی ترک نہیں کیا کہ وہ عوام کے لیے ہے اور عوام کی ہمراہی کے بغیر جمہوریت کا ہر دعویٰ غلط ہے۔ نشترؒ سب کا دوست ہے اور اس کا کوئی دشمن نہیں' سوائے ان لوگوں کے جو اس سے اپنی ناگفتہ بہ مصلحتوں کے باعث عناد رکھتے ہیں۔

(ماخوذ: کتاب ''چہرے''۔ مصنف: آغا شورش کاشمیری۔ شائع کردہ: مکتبۂ ماحول' کراچی)

ابراہیم جلیس

مجھے سردار نشترؒ سے ملنے یا انہیں قریب سے دیکھنے کی سعادت کبھی نہ حاصل ہو سکی۔ ہاں البتہ میں ان کی زندگی کے آخری دنوں میں انہیں تقریباً ہر شام کراچی کی وکٹوریہ روڈ پر غالباً ڈاکٹر کی ہدایت پر پیدل چلتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ راستہ چلنے والے انہیں بڑے ادب و احترام سے سلام کرتے تھے۔

میرا بھی بہت جی چاہتا تھا کہ کسی دن ان سے ملوں اور صرف یہ پوچھوں کہ: اب آپ نہ گورنر ہیں اور نہ وزیر بلکہ ایک عام آدمی رہ گئے ہیں پھر بھی لوگ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں اور آپ کی شخصیت میں یہ مقناطیسیت کیسی ہے''۔

ایک شام میں نے ارادہ کیا کہ آج سردار نشترؒ صاحب کو سلام کروں گا اور پھر ان کے ساتھ ساتھ چل پڑوں گا اور یہی سوال کروں گا۔

چنانچہ میں اس ارادے کے ساتھ وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر کھڑا ہو گیا اور ان کا انتظار کرتا رہا لیکن اس شام وہ نہیں آئے۔ پھر کئی شامیں ان کا انتظار کرتا رہا وہ نہیں آئے۔ بالآخر ایک صبح اخبار کے ہاکر نے آواز لگائی کہ: ''سردار نشترؒ وکٹوریہ روڈ پر ٹہلنے کبھی نہیں آئیں گے''۔

پھر میں نے سردار نشترؒ کی آخری آرام گاہ دیکھی اور اس دن سے آج تک کبھی کبھی یا اکثر یہ ضرور سوچتا ہوں کہ سردار نشترؒ کی طرح ان کے ہمعصر، ہم رتبہ، ہم پلہ اور ہم قد بھی بہت سے مسلمان یا مسلم لیگی رہنما ہو گزرے ہیں لیکن یہ سعادت یا عزت صرف سردار نشترؒ ہی کو کیوں ملی کہ وہ قائداعظمؒ، مادرِ ملتؒ اور لیاقت علی خان کے قریب محوِ خواب دوام ہیں۔

ملک غلام محمد بھی تو سردار نشترؒ کے ہمعصر، ہم رتبہ اور ہم مسلک رہنما تھے بلکہ ملک غلام محمد تو عہدہ کے لحاظ سے سردار نشترؒ سے بھی بہت بڑے تھے یعنی سربراہِ مملکت پاکستان تھے۔ انہیں ایسا قرب اور ایسی باوقار آخری آرام گاہ کیوں نصیب نہ ہو سکی۔ ان کی آخری آرام گاہ کہاں ہے؟

ان کی یاد اس طرح ہر سال ادب و احترام سے کیوں نہیں منائی جاتی؟ تاریخ عالم میں ایسے سوالات کا مختصر ترین جواب ہے:-

''عوام کا پیار''

جس رہنما کو اس کے عوام کا پیار حاصل ہو جائے پھر وہ اس وقت تک ضرور زندہ رہتا ہے جب تک کہ دنیا کے افق سے سورج طلوع ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی زندگی کی آخری تھکن سے چور ہو کر ہمیشہ کے لیے زمین میں لیٹ جائے تب بھی عوام اس کی یاد کو اپنے پیار کا تنفس عطا کر کے اپنے دلوں میں زندہ کر لیتے ہیں۔

حضرت خضرؑ کے بعد ''آبِ حیات'' کسی کو میسر نہیں آیا لیکن میں سوچتا ہوں کہ: کیا عوام کا پیار آبِ حیات نہیں؟

میں نے تاریخِ عالم کے عجائب گھر میں تو یہی دیکھا ہے کہ: ''جسے عوام کا پیار میسر آ گیا' اُس

نے جیسے آبِ حیات پی لیا۔

عوام اپنے پیار کا آبِ حیات صرف اس انسان کو پلاتے ہیں جو ان سے بے لوث محبت کرے۔ انہیں دھوکہ نہ دے' انہیں فروخت نہ کرے' ان کی بے غرض خدمت کرے' ان پر حکومت نہ کرے یا ان کے جسموں پر حکومت نہ کرے بلکہ ان کے دلوں پر حکومت کرے۔''

عوام نے سردار نشترؒ کو بھی اپنے پیار کا آبِ حیات پلایا تھا اور یہ وہی عوام ہیں جن میں سو میں سے ننانوے آدمی یہ نہیں جانتے کہ سردار نشترؒ کے ایک ہمعصر رہنما اور پاکستان کے نہایت طاقتور اور با اختیار دوسرے سربراہ مملکت ملک غلام محمد کہاں دفن ہیں۔

یادش بخیر! مرحوم غلام محمد کے بارے میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ایک حکایت یاد آتی ہے کہ جب چند چاپلوسوں اور کاسہ لیسوں نے ملک غلام محمد کو ''محافظ ملت'' کا خطاب پیش کیا تو اسی دن ملک غلام محمد جو خدا کے برگزیدہ بندوں کی خدمت میں بالعموم حاضری دینے کے عادی تھے ایک درویش کے حضور پہنچے۔ اس درویش خدا مست نے ملک صاحب کو نصیحت کی۔

''اپنے طریقۂ حکمرانی میں تبدیلی کر' ان چند چاپلوسوں کی خوشامد پر نہ جا' عوام کے دل جیت' سنگین جب تک عوام کے سینے پر رہتی ہے' وہ خاموش رہتے ہیں' جیسے ہی سنگین ہٹ جاتی ہے' تیرے خلاف نفرت کا لاوا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے۔ اگر تو نے اپنے طریقۂ حکمرانی میں تبدیلی نہ کی تو جس دن تو گدی سے ہٹے گا یا مرے گا عوام خوشی کا جشن منائیں گے اور تیری یادگاریں اور تیری تصویریں سڑکوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر ہوں گی۔ جیسے ہی ہٹے گا یا مرے گا اس ملک کی تاریخ میں مستقبل میں تیرا نام کبھی بھی عزت و احترام سے نہیں لیا جائے گا''۔

راوی بیان کرتا ہے کہ یہ نصیحت سن کر ملک غلام نے آبدیدہ ہو کر فوراً توبہ کی لیکن اس

وقت شاید درتو بہ بند ہو چکا تھا۔ واللہ علم جب تک ملک غلام محمد زندہ تھے ان کی کیا نشانی تھی؟ کیا رعب تھا' کیا دبدبہ تھا۔ بڑے بڑے وزیر ان کی ایک آواز پر تھر تھر کانپتے تھے لیکن ایسے بارعب اور ایسے طاقتور آہن پیکر حکمران کی نہ اب کہیں قبر نظر آتی ہے' نہ برسی منائی جاتی ہے حالانکہ انہیں ''محافظِ ملت'' کا خطاب پیش کرنے والے بہت سے چاپلوس ابھی تک زندہ ہیں۔ ان میں بھی آج تک کوئی ان کی قبر پر ایک پھول تک چڑھانے نہیں جاتا۔

لیکن ادھر آؤ اور دیکھو کہ: ''سردار نشترؒ کی قبر ہے یا پھولوں کا ڈھیر ہے؟'' عوام جنہیں اپنے پیار کا آبِ حیات پلاتے ہیں' اُن کی قبر مٹی کی نہیں صرف پھولوں کی ہوتی ہے''

(ماخوذ: کتاب ''آسمان کے باشندے''۔ مطبوعہ: پاک کتاب گھر' کراچی)

الطاف حسن قریشی

نشترؒ صاحب نے جمہوریت کی روح کو زندہ رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ وہ مساوات اور قانون کی علم داری کو جمہوریت کی اساس سمجھتے تھے۔ اس عقیدے کا اظہار اُنہوں نے صرف تقریروں ہی میں نہیں کیا بلکہ اپنے کردار سے اس کی عملی تعبیر بھی پیش کی۔

جمیل نشتر صاحب نے بتایا کہ 1957ء کے آخر میں والد صاحب پر اختلاجِ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ان سے کسی کو ملنے نہ دیا جائے۔ ایک روز چندریگر مرحوم والد صاحب سے ملنے آئے۔ وہ ان دنوں وزیراعظم تھے۔ میں نے اس احساس کے ساتھ کہ چندریگر کسی بہت ضروری کام سے آئے ہوں گے۔ انہیں والد صاحب کے کمرے میں بھیج دیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ چلے گئے۔ اتنے میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا سالار سردار علی جان آ گیا اور مجھ سے کہا کہ میں صرف ایک منٹ کے لیے نشترؒ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ بس ایک نظر ڈال کر واپس چلا جاؤں گا۔ میں نے اسے سخت سست کہا کہ تمہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ تمہارے اس طرح ملنے جلنے سے نشترؒ

صاحب کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ دو چار منٹ ہم دونوں زور زور سے بولتے رہے۔ آخر علی جان واپس جانے لگے۔ اتنے میں والد صاحب کی آواز بلند ہوئی۔ انہوں نے مجھے پکارا تھا۔ میں اندر گیا تو کہنے لگے:۔

''جب وزیر اعظم صاحب آئے تو تم نے انہیں اندر آنے دیا اور جب علی جان آیا تو تم نے اُسے اس لیے روک دیا کہ وہ ایک غریب آدمی ہے۔ بلاؤ اسے بلاؤ میرا سرمایہ یہی مخلص کارکن ہیں۔ میں زندگی بھر امتیازات کے خلاف لڑتا رہا۔ کیا تم آخری وقت میں میری کمائی ضائع کر دینا چاہتے ہو؟''

قانون کا احترام ان کے دل میں اس درجے تھا کہ کبھی کوئی کام قانون کی منشا کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ احسن صاحب اور خان بہادر رشید خان صاحب وزارت اور گورنری کے زمانے میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ نشترؒ صاحب نے ہمیں کبھی کسی فائل کے بارے میں خاص ہدایات نہیں دیں اور نہ کبھی کسی فائل کو ''مختصر راستے'' سے گزرنے دیا۔ وہ قانونی تقاضوں اور قانون کے طریق کار کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور پھر وہ دور بھی آیا جب وہ اقتدار کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے اور ایک خاص ایلچی نے نشترؒ صاحب سے کہا کہ وہ کراچی چھوڑ دیں۔ انہوں نے جواب دیا: اگر یہ حکم مجھے تحریری طور پر دیا جائے تو میں ابھی کراچی چھوڑ دوں گا''۔ یہ جواب دے کر گھر والوں کو سامان باندھنے کے لیے کہہ دیا۔ عزیزوں اور دوستوں نے زور دیا کہ نشترؒ صاحب کو کسی حالت میں کراچی نہیں چھوڑنی چاہیے۔

معلوم ہے نشترؒ صاحب کا کیا جواب تھا؟ انہوں نے ایک ہی بات کہی' میں ایک عرصے تک خود قانون سازی میں شریک رہا ہوں۔ میں ہر حالت میں قانون کا احترام کروں گا۔ نشترؒ صاحب کو تحریری حکم وصول نہ ہوا۔ اس لیے وہ کراچی میں ہی مقیم رہے۔

وہ آئینی اور اخلاقی طریقوں اور ضابطوں کو سب سے اچھا ضابطہ سمجھتے تھے۔ جب نشترؒ صاحب کو خان لیاقت علی خان کی شہادت کی خبر ملی تو ان پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ان کے قریبی حلقوں کا مشاہدہ ہے کہ انہوں نے صرف اس دن نشترؒ صاحب کو گھبراہٹ کے عالم میں دیکھا۔ وہ راولپنڈی سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچے اور لیاقت مرحوم کی نعش پر سر جھکا کر بیٹھ گئے اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔

اس ماحول کے پس منظر میں وزارتِ عظمیٰ کے لیے جوڑتوڑ ہو رہا تھا۔ کچھ معتمدین نے نشترؒ صاحب سے کہا کہ کابینہ کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ آپ بھی چلئے آپ کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اس پر سردار صاحب پہلے تو خاموش رہے اور پھر بھی خواہوں کے بار بار اصرار پر صرف اتنا کہا: ''اس وقت میں کابینہ کے اجلاس میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ میری طبیعت آمادہ نہیں ہے۔'' مبصرین کا خیال تھا کہ اگر نشترؒ صاحب کابینہ کی میٹنگ میں ہوتے تو ان کا وزیراعظم بن جانا یقینی تھا۔

نشترؒ صاحب حد درجہ فرض شناسی اور مستعدی سے کام کرتے تھے۔ ان کا کام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے۔ نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر فائلیں لے کر بیٹھ جاتے۔ 9 بجے تک فائلیں دیکھتے۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس کے بعد پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔ دوپہر کا کھانا اکثر رہ جاتا تھا۔ رات تک یہی کیفیت رہتی۔ جب شاہ ایران لاہور آئے، اُس وقت نشترؒ صاحب گورنر تھے اور ان پر اسی دن لقوے کا حملہ ہوا تھا۔ شدید تکلیف کے باوجود وہ تمام تقریبات میں شامل ہوئے اور اپنے فرائض پوری ذمے داری سے بجالائے۔ وفات سے ایک دن پہلے مختلف دوستوں سے یہی باتیں کرتے رہے کہ میں اب تندرست ہوتا جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی پوری تندہی سے کام شروع کر دوں گا۔

موت اور تکالیف سے وہ بالکل نہیں گھبراتے تھے۔ یہ 1949ء کے وسط کا واقعہ

ہے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر پاکستانی سپاہیوں نے افغانستان کی سرحد پر گولیاں چلا دیں۔ افغان حکومت نے اس پر احتجاج کیا۔ حکومتِ پاکستان نے نشترؒ صاحب کو واقعہ کی تحقیقات کے لیے کابل بھیجا۔ پشاور سے افغانستان کے دو ہوائی جہاز نشترؒ صاحب اور ان کے عملے کو لے کر اُڑے۔ ایک جہاز میں نشترؒ صاحب اور افغانی وزراء تھے جبکہ دوسرے جہاز میں نشترؒ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری احسن صاحب اور متعلقہ عملہ تھا۔ نشترؒ صاحب کا جہاز جب پہاڑ کی بلندیوں کی طرف بڑھا تو پائلٹ راستہ بھول گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوائی جہاز بھٹکتا رہا۔ افغانی وزراء پائلٹ پر بری طرح برس رہے تھے اور گھبراہٹ سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُنہوں نے پائلٹ کو لینڈنگ کرنے کا حکم دیا۔ پائلٹ ایک صاف جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب ذرا اور نیچے آیا تو دیکھا کہ نیچے بھیڑیں چر رہی ہیں۔ اسے دوبارہ جہاز کو اوپر لے جانا پڑا۔ پائلٹ نے اپنے وزیروں کے حکم کے مطابق کئی بار فورسڈ لینڈنگ کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار ناکام رہا۔ اس سے افغان وزراء اور بھی بدحواس ہو گئے۔

نشترؒ صاحب کے چہرے پر طمانیت کا تبسم پھیلا ہوا تھا۔ افغان دوست حیران تھے کہ ایسے عالم میں مسکرایا کیونکر جا سکتا ہے۔ نشترؒ صاحب پائلٹ سے محبت اور شفقت سے باتیں کرتے رہے اور ایک مقام پر اسے بتایا کہ تم دائیں ہاتھ مڑ کر پیچھے کی طرف آ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں راستہ مل جائے گا۔ پائلٹ نے ایسا ہی کیا اور دو تین منٹ بعد پائلٹ صحیح راستہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

نشترؒ صاحب کا خیال تھا کہ جب ہمارا جہاز بھٹک گیا ہے تو خدا جانے دوسرے جہاز کا کیا حال ہوگا۔ انہوں نے زمین پر قدم رکھتے ہی پہلا سوال کیا: ''احسن کے جہاز کا کیا ہوا؟'' احسن پشت کی جانب کھڑے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ہمیں تو یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے۔

اپنے ماتحتوں سے محبت اور دوستی کا برتاؤ کرتے تھے۔ احسن صاحب کا بیان ہے کہ وہ مجھے اپنا لڑکا سمجھتے تھے۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے کی جو نئی چیز بھی کہیں سے آتی تھی یا گھر میں تیار ہوتی تھی وہ مجھے ضرور بھیجتے تھے۔ ہوائی جہاز کے جس واقعے کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ انہیں اپنے ساتھیوں سے نہایت ہی گہرا تعلق تھا۔

خان بہادر رشید خان صاحب بھی اسی محبت اور شفقت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وکالت کے زمانے کے چند منشیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ نشترؒ صاحب کے حسنِ اخلاق کی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

وہ انکسار اور سادگی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آغاز جوانی میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمیشہ کھدر کی قمیض پہنا کریں گے۔ چنانچہ یہ عہد عمر بھر قائم رہا۔ شیروانی کے نیچے ہمیشہ کھدر کی قمیض ہوتی تھی۔ سبزیوں میں انہیں کدّو بہت پسند تھا۔ خوراک تھی ہی بہت سادہ' انہوں نے اپنے اوپر غیر ضروری تکلفات کبھی نہیں لادے۔ وہ اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ لطیف رکھنا چاہتے تھے۔

اس پُر ہنگام زندگی کے باوصف وہ شعر و شاعری کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور خود بھی اُردو اور فارسی میں اچھے خاصے خوبصورت شعر کہے ہیں۔ شعر کے ساتھ ساتھ شعر کے خالق سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک دفعہ جگر صاحب لاہور تشریف لائے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک پرانے دوست برصغیر پاک و ہند کے نامور فلسفہ دان سے ہوئی۔ جگر صاحب نے ان سے پوچھا کیا کر رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب (فلسفہ دان) نے جواب دیا: ''بحالیات میں کلرکی کر رہا ہوں''۔

''کیا کہا؟'' جگر صاحب نے چونک کر کہا۔ ''کلرکی کر رہے ہو؟ بحالیات میں؟ یعنی ہرن پر گھاس لادی جا رہی ہے۔ میں ابھی نشترؒ صاحب سے بات کرتا ہوں''۔ جگر صاحب نے

نشترؒ صاحب (گورنر صاحب) کوفون کیا۔ انہوں نے کہا ابھی تشریف لے آیئے۔ جگر صاحب جب گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے پر پہنچے تو نشترؒ صاحب کو اپنا منتظر پایا۔ نشترؒ صاحب جگر صاحب کے پیچھے پیچھے اس طرح چل رہے تھے۔ جیسے پرانے وقتوں کے شاگرد اُستاد کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ جگر صاحب نے مدعا بیان کیا تو نشترؒ صاحب نے کہا:-

''اچھا میں اس مسئلے پر ذاتی دلچسپی لوں گا''۔ لیکن جگر صاحب مصر تھے کہ ابھی احکام صادر کیجیے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ ایک ڈاکٹر بحالیات میں کلرکی کر رہا ہو۔ نشترؒ صاحب نے اسی وقت احکام صادر کر دیے۔

یہاں ایک اور واقعہ یاد آ گیا (ہر واقعہ ذرا مختلف نوعیت کا ہے لیکن نشترؒ صاحب کی سیرت کے ایک اور پہلو کو نمایاں کرتا ہے)۔ ایک صاحب پشاور میں رہتے تھے۔ ان کا لڑکا علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ وہ تقسیم سے ذرا پہلے پشاور آیا' جب وہ واپس جانے لگا تو صوبہ سرحد کی حکومت نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لڑکے کا یہ آخری سال تھا۔ وہ صاحب نشترؒ صاحب کے پاس پہنچے اور اپنی تکلیف بیان کی۔ نشترؒ صاحب نے اپنے سیکرٹری کو بلایا اور کہا:-

''میں اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتا کیونکہ اس معاملے کا تعلق تو صوبہ سرحد کے ساتھ ہے''۔ سیکرٹری صاحب نے کہا' میں کچھ کوشش کرتا ہوں' چنانچہ ان کی کوششوں سے لڑکے کو اجازت نامہ مل گیا۔

ایک ڈیڑھ سال کے بعد انہی صاحب کا خط نشترؒ صاحب کے نام آیا جس میں ان کا اور ان کے سیکرٹری کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور ان دونوں کو صحت اور زندگی کی دعائیں دی تھیں۔ نشترؒ صاحب نے سیکرٹری کو خط دکھایا اور کہا:-

''اگر ہم خدمتِ خلق کے اس انداز سے کام کر سکیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اثر و نفوذ بھی

اچھے کاموں کے لیے استعمال ہونا چاہیے''۔

نشترؒ صاحب ایک مہذب انسان تھے۔ شائستگی اور سلیقے کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ باتوں میں اتنی شیرینی اور حلاوت تھی کہ جو ایک بار مل لیتا' بار بار ملنے کی آرزو کرتا۔ نہ کبھی کسی سے اُلجھتے تھے نہ کسی سے الجھنا چاہتے تھے' پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ ان پر بے بسی اور بے چارگی کے ادوار بھی آئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنوں سے بھی زخم کھائے ہیں اور غیروں سے بھی۔ لیکن کبھی کسی کا گلہ نہیں کیا' وہ تو حوصلے اور ظرف کے اعتبار سے ایک سمندر تھے جس میں وسعت بھی تھی اور گہرائی بھی۔

ان کا یہ کارنامہ صدیوں تک ایک تابندہ مثال بنا رہے گا کہ جلیل القدر عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے لڑکوں میں بڑائی کی ذرا سی بھی بو پیدا نہیں ہونے دی۔ میں جمیل نشتر صاحب اور طارق نشتر صاحب سے ملا ہوں۔ ان کے تیسرے لڑکے اجمل نشتر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے ان دونوں اصحاب کو نہایت ہی ملنسار' منکسر المزاج' بردبار اور عوامی طبیعت کا انسان پایا۔ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند کرنے کی خواہش' ہو سکتا ہے ان کے نہاں خانۂ دل میں ہو' لیکن ان کے کردار میں ذرا نہ جھلکتی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ بالخصوص اس دور میں جہاں ایک سی۔ ایس۔ پی کا بیٹا اپنے آپ کو ملک کا حاکم سمجھتا ہے' چاہے وہ سی۔ ایس۔ پی افسر اپنے آپ کو ایسا نہ سمجھتا ہو۔ آیئے ہم اس طریقِ کار کا جائزہ لیں جس نے نشترؒ صاحب کے لڑکوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔

نشترؒ صاحب نے شروع ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنے لڑکوں کو گورنمنٹ سروس کے لیے تیار نہیں کرنا ہے۔ ان کی یہ دلی آرزو تھی کہ ان کے لڑکے آزاد اور باوقار پیشہ اختیار کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لڑکوں کی ذہنی تربیت انہی خطوط پر شروع کی۔ پھر اس بات

کا خاص خیال رکھا کہ ان کا رہن سہن' ان کا لباس اور ان کے اطوار عام بچوں سے ممتاز نہ ہونے پائیں۔

نشترؒ صاحب نے اپنے بچوں کو عام سکولوں اور کالجوں میں پڑھایا اور احباب نے کہا بھی کہ انہیں ایچی سن کالج یا کسی اچھے پبلک سکول میں داخل کرائیے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ سکولوں کا یہی امتیاز بچوں میں غلط قسم کا احساس برتری پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا کہ بچے سکول گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی میں نہ جائیں' چنانچہ وہ سائیکلوں پر سکول جایا کرتے تھے۔

ایک بار بچوں کو سکول لے جانے کے لیے گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی استعمال ہوئی۔ نشترؒ صاحب کو پتا چلا تو بہت خفا ہوئے اور گاڑی کے محافظ سے کہنے لگے: ''کیا تم چاہتے ہو کہ میرے بچوں میں غرور اور نخوت پیدا ہو جائے اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ عام بچوں سے بہت اونچے ہیں۔ جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تو ان کے لڑکے کالی شیروانی میں ان کے ساتھ ہوتے۔ ان احتیاطوں سے لڑکوں کا وہ کردار ابھر آیا جس پر رشک کیا جا سکتا ہے۔

نشترؒ صاحب کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ ان میں قوتِ فیصلہ کی بہت کمی تھی۔ وہ عموماً بہت دیر سے فیصلہ کرتے تھے اور بعض اوقات فیصلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ نشترؒ صاحب کی کمزوری ہو۔ وہ بہر حال انسان تھے' ان میں یقیناً کمزوریاں بھی تھیں اور خامیاں بھی لیکن جہاں تک قوت فیصلہ کا تعلق ہے' اس میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ سیاسی اور جمہوریت پسند ذہن چونکہ معاملے کے بہت سے پہلوؤں پر غور کرتا ہے' اس لیے تاخیر ناگزیر ہے۔

نشترؒ صاحب قانونی ذہن بھی رکھتے تھے۔ اس لیے بہت گہرائی میں اتر جاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ ایک پہلو سے تحریکِ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ اسے صفِ اول کے لوگ قانون دانوں میں ملے۔ ایک قانون دان کے نزدیک تخلیقِ پاکستان کے عمل

میں ساری اہمیت پارلیمنٹ کے اس قانون کو حاصل ہے جس کی رو سے پاکستان آزاد ہوا۔ اس توجیہہ کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نشترؒ صاحب طبعاً ایک سلجھ جوا اور معتدل انسان تھے۔ وہ چیلنج کو قبول کرنا جانتے تھے لیکن خود دوسروں کے لیے چیلنج نہیں بن سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نازک موقعوں پر نشترؒ صاحب وہ مؤثر کردار ادا نہ کر سکے جس کی عوام ان سے توقع رکھتے تھے۔

ہمیں نشترؒ صاحب کی مسکراتی ہوئی گھنی مونچھیں پیاری لگتی تھیں۔ وہ شیروانی اور شلوار میں حسین نظر آتے تھے۔ ان کی شخصیت کی دل کشی ہمارے دلوں کو موہ لیتی تھی لیکن سب سے قیمتی سرمایہ ان کا وہ دل تھا جو اسلام، پاکستان، پاکستانی عوام کے لیے ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ اس دل کے بند ہو جانے سے اب یہ دھڑکن بھی بہت دھیمی پڑ گئی ہے۔

(ماخوذ: سالنامہ ''اُردو ڈائجسٹ'' جون 1966ء)

☆☆☆

اشاریہ

ابراہیم جلیس -116
ابوالکلام آزاد 2-20-22-30-40-114
ادارہ تبلیغ اسلام -25
اردو-16-36-44-48-73-74-75-
76-77-78-79-80-81-82-83-
84-85-87-88-95-103-104-
123-127-
اسلامیہ کالج -32
اشتیاق حسین قریشی -51
اشرف علی تھانوی -24
افغانستان -23-122
اکبرالہ آبادی -104
الطاف حسن قریشی-18-45-46-49-119
امان اللہ خان -23
اورنگ زیب خان-12-11-34-35-38
ایڈورڈز کالج -32
ایسٹ انڈیا کمپنی -13
آزاد مسلم پارٹی -31
آئی آئی چندریگر -41-68-70-119
بازار شہیداں -29
بنارس -22
بندے ماترم -33
پرتھوی راج -27
پرچم -32-34-56-91-92-93-94-95
پنجاب -13-14-16-23-35-36
-44-49-52-53-73-74-76-77
-84-85-87-88-89-90-91-115
پیر مہر علی شاہ -24
تحریک ہجرت -22-23-44
تحریک خلافت -18-20-21-22-23
-24-25-26-27-28-45-66-104
-105-115
تمیز الدین خان -46
جارج کننگھم -39-63
جگتو فرنٹ -54
جلیانوالہ -21
جی ایم سید -11
چراغ حسن حسرت -50
حسرت موہانی -20-104
حکیم اجمل خان -20-24-104
خاق دیناہال -47
خان عبدالغفار خان -30-31-38-70

خدام المہاجرین -23
خضر حیات خان ٹوانہ -35
خلافت عثمانیہ -21-20
خواجہ شہاب الدین -54-53
خواجہ ناظم الدین -56-55-54-53
-77-58-57
راج پال -26
راجندر پرشاد -91-42
رابعہ غضنفر علی خان -41
رنجیت سنگھ -13
ری پبلکن پارٹی -61
سائمن کمیشن -27
سرخ پوش تحریک -32
سردار اورنگ زیب -35-34
سردار بہادر خان -53
سردار پٹیل 91-43-42
سردار عبدالرب نشتر -25-24-12-11
-40-36-35-34-33-32-29-28
-52-49-48-45-44-43-42-41
-62-61-58-57-56-55-57-53
-88-77-73-71-69-68-67-64
-103-100-95-91
سکندر مرزا -61-58-57-55-54
سندھ -92-58-40-23-13-11
سنگھٹن -25-24
سید عطاء اللہ شاہ بخاری -26-25
شاہ محمد غوث گیلانی -16
شدھی -25-24-22
شردھانند -25-22
شملہ کانفرنس -37
شورش کاشمیری -116-114-103-22
صاحبزادہ عبدالقیوم -31
ظفر علی خان -104-26-25-20
ظفر اللہ خان -44
عبداللہ ہارون -11
علی گڑھ -124-25-21-18-17
غزنی -13
فضل الحق -74
قاضی محمد عیسیٰ -11
قائداعظمؒ -31-28-27-26-20-11
-46-45-44-40-38-36-34-32
-81-80-76-71-70-51-48-47
-102-94-93-92-91-90-89-88
-117-115
قندھار -15-13
کابل -122-23-13

کانگریس -12-21-27-28-30-31
-32-33-34-35-37-38-39-40
41-43-63-69-115
کرزن -14
کشمیر 13-45-65-90
گاندھی -20-22-24-41-43-63-64
لارڈ ایلن -40
لارڈ ویول -37-63
ماؤنٹ بیٹن -41-42
محترمہ فاطمہ جناح -51
محمد علی بوگرا -56-57
محمد علی جوہر -18-21-22-25
-26-27-60-115
مسلم ایسوسی ایشن -31
مسلم لیگ -11-12-26-27-31
-32-33-34-35-36-37-38-39
-40-41-42-46-47-48-49-51
-54-56-60-61-62-63-64-65
-66-68-70-71-89-93-94-100
-101-102-114-115-116-119
مشتاق احمد گورمانی -54
مصطفےٰ کمال پاشا -20-25
ملتان -13-24
ملک غلام محمد -54-55-56-57-58
-117-118-119
ملک فیروز خان نون -70-71
مولانا صلاح الدین احمد -50
مولوی عبدالحق -73-77-86
میاں ممتاز محمد خان دولتانہ -52-53
میر جعفر خان جمالی -11
نادر شاہ درانی -13
نواب بھوپال -41
نواب زادہ لیاقت علی خان -40-41-42
-43-44-48-51-52-53-54-55
-92-94-95-117-121
نواب محمد اسماعیل خان -25-40-51-104
نہرو -28-30-40-43-63
-64-89-92
وارڈھا تعلیمی سکیم -34
یوم راست اقدام -41
یوم نجات -33-34
یونینسٹ پارٹی -35

☆☆☆

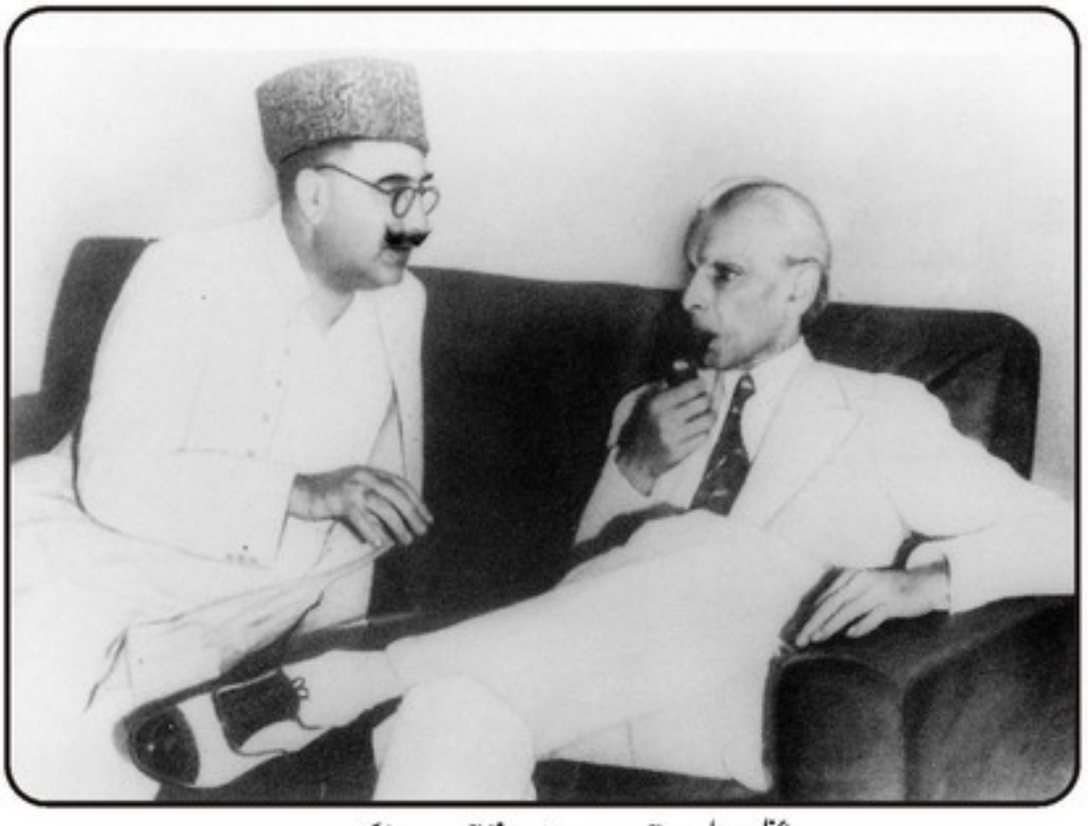

قائداعظم محمد علی جناحؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ تبادلۂ خیال کر رہے ہیں

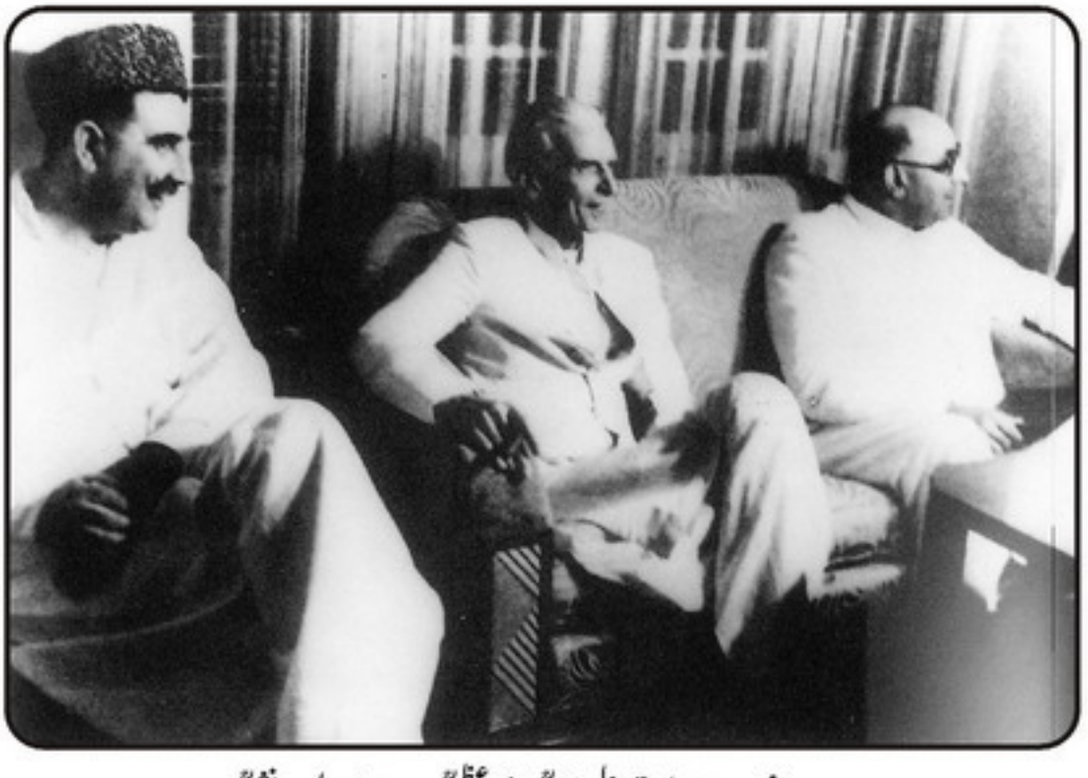

نواب زادہ لیاقت علی خانؒ، قائداعظمؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ

1946ء (دائیں سے بائیں) سردار عبدالرب نشترؒ، نواب زادہ لیاقت علی خانؒ، سٹیفورڈ کرپس، اے وی الیگزینڈر، لارڈ پیتھک لارنس اور قائداعظمؒ

2 جون 1947ء دہلی اعلان تقسیم ہند اور اقتدار کی منتقلی کے فیصلے کے موقع پر لی گئی تصویر (دائیں سے بائیں) سردار عبدالرب نشترؒ، نواب زادہ لیاقت علی خانؒ، قائداعظمؒ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو، سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی اور سردار بلدیو سنگھ

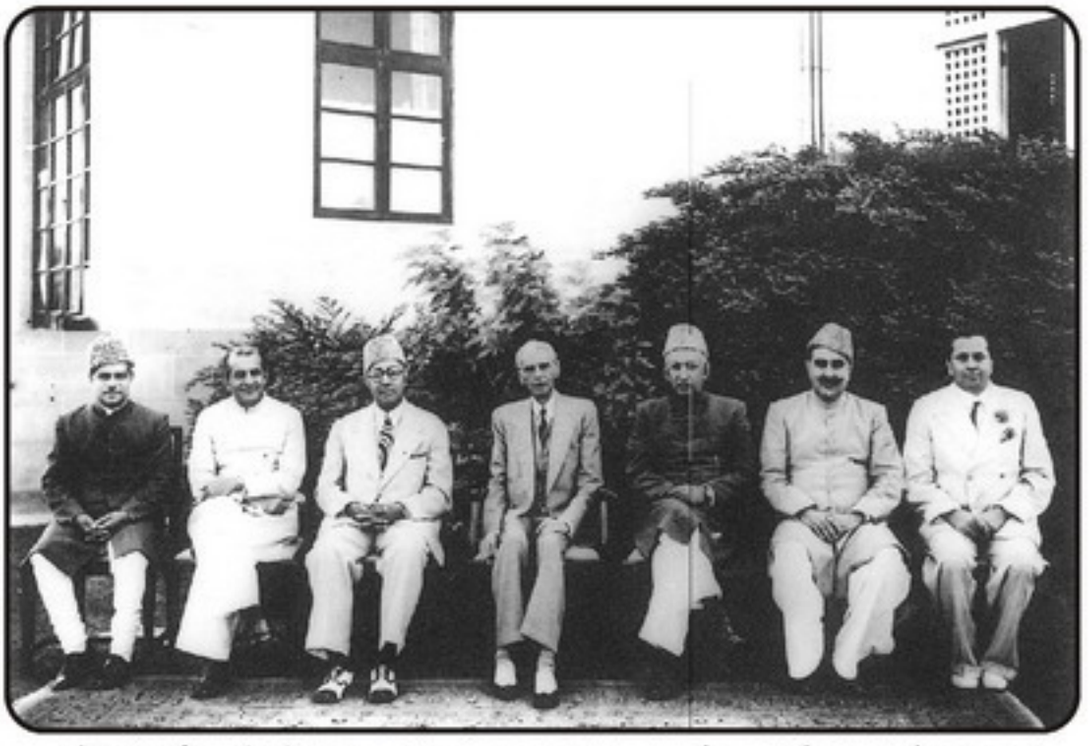

پاکستان کی پہلی کابینہ: (دائیں سے بائیں) پیرزادہ عبدالستار، سردار عبدالرب نشترؒ، آئی آئی چندریگرؒ، قائداعظمؒ،
نواب زادہ لیاقت علی خانؒ، غلام محمد اور فضل الرحمٰن

یوم آزادی کے موقع پر کراچی میں ایک ضیافت سے قائداعظمؒ کا خطاب، مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے دائیں
جناب سردار عبدالرب نشترؒ تشریف فرما ہیں

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ سردار عبدالرب نشترؒ کی ایک یادگار تصویر

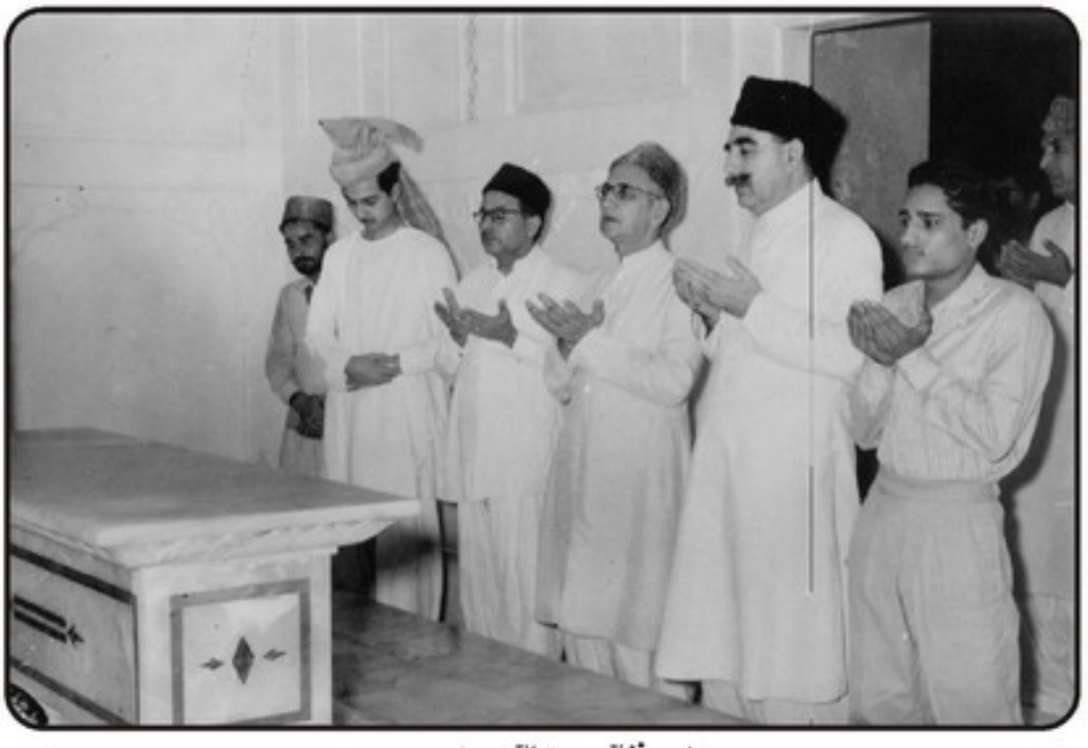

سردار عبدالرب نشترؒ مزار اقبالؒ پر حاضری دیتے ہوئے

مفتیٔ اعظم فلسطین سید محمد امین الحسین کے ہمراہ سردار عبدالرب نشترؒ کی ایک تاریخی تصویر